ISSN 0974-7346

دسمبر ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۱۲

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

# سالانہ زر تعاون

| | |
|---|---|
| ہندوستان | سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۵۵ روپے۔<br>۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔<br>لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔ |
| دیگر ممالک | رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔<br>ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔<br>اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔ |
| بذریعہ ایمیل | اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔ |

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

---

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

# معارف

| جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۲۳ء | عدد ۱۲ |
| --- | --- | --- |

## فہرست مضامین





دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

# شذرات

اسرائیل، غازہ، حماس پر بین الاقوامی گفتگو کا جو سلسلہ گذشتہ ماہ شروع ہوا وہ اب سوشل میڈیا اور عنکبوتی صحافت کے علاوہ مذہب و تاریخ اقوام کے تحقیقی مطالعہ پر بھی محیط ہوتا جاتا ہے۔ قدیم اقوام ہوں یا مذاہب، آسمانی کتابیں ہوں یا زمینی صحیفے، فلسطین کا موضوع کبھی انسان کی قابل بحث تاریخ سے جدا نہیں ہوا، لیکن قریب ڈیڑھ سو سال سے دولت عثمانیہ کے زوال، عرب قومیت کی نشو و نما اور دو دو عالمی جنگوں کے نتائج اور اثرات کے پس منظر میں یہودیوں کے ملک کے قیام کے بعد اس مسئلہ نے رہ رہ کر چنگاریوں کی چمک سے رقص شرر کا جو منظر پیش کیا وہ شرق اوسط کی مذہبی و سیاسی ماحول کے لیے قطعی اجنبی اور اسی لیے ناقابل قبول ہے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز سے عالمی سیاست سے زیادہ عالمی معیشت نے حقائق کو دیکھنے اور تاریخ کے انسانی نقطہ نظر سے جائزہ لینے کے پیمانے جس طرح بدلے، اس سے جغرافیائی ضرورتوں اور ان کی اہمیت کے انداز نظر بھی بدلے۔ معیشت کو امور مملکت میں عام طور سے اولیت حاصل ہوئی، اس سے مسئلہ فلسطین کی سنگینی کو نئے سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے کم کر کے دکھانے کی کوشش کچھ اس طرح کی کہ مسائل و مصائب تو بڑھتے گئے ساتھ ہی ان کے ذکر اور اس کی فکر کو بڑے فن کارانہ طریقہ سے چھپانے کی کوشش بھی بڑھتی گئی۔ اب جب غزہ نے غزوؤں کی یاد دلانے کی ہمت کی تو یہ احساس حق بجانب ہی ہوا کہ اب مسئلہ فلسطین پھر سے زندہ ہو گیا۔ زندہ ان معنوں میں کہ نئی نسل پرست طاقت، نئی صہیونی فکر اور نئی سرمایہ داری کے پردے میں قدیم مذہبی نفرت، قدیم صلیبی جارحیت، پرانی جاہلی عصبیت کا مطالعہ اور تجزیہ زیادہ سنجیدگی اور انسانی ذمہ داری کے ساتھ پھر سے کیے جانے کا احساس زندہ ہو گیا اور صاف صاف کہا جائے تو اس کی تہہ میں اسلام اور اس کے مقابل صلیب اور کفر کی ملت واحدہ کی وہ بنیادی کشمکش سامنے آئی جس کو بلیغ ترین انداز میں چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غزہ اور فلسطینیوں نے ایک بار پھر اسی تعبیر کو نئی عبارت عطا کر دی جواب اور بھی غور اور فکر کی طالب ہے۔ جس سے یہودی، مسیحی تعلقات اور بعضہم اولیاء بعض میں پوشیدہ بنیادی حقیقت کو زیادہ وضاحت اور صراحت سے پڑھنے اور پڑھے جانے کا شوق فطری طور پر بڑھ جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یورپ اور شرق اوسط ہی نہیں پوری دنیا کے لیے یہودی، صلیبی اور دونوں کے نتیجہ اتصال صہیونی نظام کو سمجھنا ضروری ہے اور اس کے لیے بنیادی اور اصولی بیانات اس کتاب میں دیکھنے کی ضرورت ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے حق و باطل کے چہروں کو پہچاننے میں کوئی اشتباہ ہو سکے۔ قرآنی بیانات یا ان سے پہلے بائبل کی روایات یا اسلام سے پہلے نصرانی یہودی معاملات کی جانب اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ اس قوم کی یا ان اقوام کی تاریخ کا تفصیل سے مطالعہ ساری قوموں

کے لیے اور خاص طور سے اسلام کی بنیاد پر وجود میں آنے والی قوم کے لیے ہمیشہ ہی اولیت اور ترجیح کا تقاضہ کرتا رہا ہے۔ صہیونیت کا فلسفہ، در حقیقت غارت گریِٔ اقوام کا فلسفہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہودیت اور مسیحیت یا نصرانیت دو متضاد بلکہ متحارب رویوں کی شکل میں اپنی شناخت ظاہر کرتے رہے ہیں۔ ماضی بعید سے صرف نظر کر کے اگر صرف موجودہ صدی سے متصل ماضی کی چند صدیوں کو دیکھا جائے جن کو لیٹ مڈل ایج سے تعبیر کیا گیا اور جن کا زمانہ تیرہویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک ایک بڑے مورخ سالو دیبرن نے متعین کیا ہے تو حقائق یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پہلے بھی ان دونوں قوموں میں سماجی، مذہبی اور معاشرتی مناقشات اور فسادات ہوتے رہتے تھے، لیکن ان پانچ صدیوں میں جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، پولینڈ، فرانس اور انگلینڈ میں یہود کش منصوبوں کو سرکاری سرپرستی ملی، وہ دور بھی آیا جب یورپ سے اخراج یہود، وہاں کی حکومتوں کا فرض اولیں قرار پایا۔ چودہویں صدی میں ان ملکوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہودیوں پر موت کا سیاہ بادل چھا گیا، یہودیوں کی آبادیوں میں کنوؤں میں زہر گھول دیا گیا، اسپین میں سقوط غرناطہ کے بعد یہودیوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ سولہویں صدی میں فرانس سے یہ چن چن کر نکالے گئے۔ اس نفرت کے پیچھے عیسائیوں کا یہ عام عقیدہ کارفرما تھا کہ یہودی قوم کے مزاج میں غداری اور بے وفائی ہے، وہ کسی ملک کے وفادار ہو ہی نہیں سکتے۔ یہودیت اور وفاداری دو متضاد اصطلاحات ہیں۔ اس یہودیت نے کیا کیا گل نہیں کھلائے، تحریک اصلاحات کے بارے میں رومی چرچ کو جب یقین ہو گیا کہ اس تحریک میں یہودیوں کا ذہن اور ہاتھ ہے تو پوپ سوم نے ان کے لیے ذلت کے نشانات بنوائے، ذلت کے یہ بیج ہر یہودی کے لیے بطور شناخت لازمی قرار دیے گئے۔ یہودی یورپ میں در بدر پھرتے رہے لیکن عیسائیوں کے اپنے مسائل میں الجھے رہنے سے ان یہودیوں کو سانس لینے کا موقع بھی ملتا رہا، پھر بھی سترہویں صدی تک ان کا قتل عام جاری رہا، تاہم یہودی ذہنیت تخریب کاری کے لیے گنجایش کی تلاش میں یوں رہی کہ اس نے پورے یورپ کو مختلف تحریکوں میں مصروف کر دیا۔ انقلاب فرانس کی بنیاد میں اخوت، مساوات اور آزادی کو شامل کرنے سے سب سے زیادہ فائدہ کی امید وہاں کے یہودیوں ہی کو تھی۔ لیکن ذلت ان سے چپکی ہی رہی، یہاں تک کہ نپولین ان کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا۔ انیسویں صدی میں جا کر مغربی اور وسط یورپ میں ان کو کچھ سیاسی حقوق حاصل ہوئے، پھر بھی ان علاقوں میں قتل عام سے بچ جانے والے یہود مشرقی یورپ میں جا بسے، لیکن وہاں کا حال مغربی یورپ سے بھی بدتر ہوا۔ یہودیوں کی ذلت و مسکنت کی یہ داستان خود یورپ کے مورخوں کی زبانی ہے۔ کیسے کیسے راز کھلتے رہے۔ روس نے جاپان سے ۱۹۰۴ء میں شکست کھائی تو اس کے یقین کے لیے ثبوت مل گئے کہ یہ شکست یہودی سازش کا نتیجہ تھی۔ روس کے مزدوروں کی بغاوت اور پھر اشتراکیت کی تحریک میں اسی یہودی سازش کی نشاندہی کی گئی۔ ہٹلر کی یہودیوں

سے شہرہ آفاق نفرت کا جائزہ لیا گیا تو یہی ملا کہ پورا یورپ قطعی اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ نجس یہودی قوم کو وہ تعلیم، معیشت اور ملازمت میں اپنا مساوی دیکھیں۔ اسی خیال نے جب تحریک کا قالب اختیار کیا تو تحریک کا قائد اعظم ہٹلر کی صورت میں نمودار ہوا۔ ان تاریخی جھلکیوں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں کی ذلت و مسکنت کے جو اسباب بتائے ان پر پھر سے ایمان لانا ضروری ہے کہ ان یہودیوں کا وطیرہ یہی بن گیا کہ وہ قانون فطرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے خیر خواہوں کو ناحق قتل کرتے پھرتے ہیں اور نبیوں جیسے خیر خواہوں کے علاوہ خون ناحق کی ان کی پیاس ہر اس شخص کی رگ گلو پر خنجر چلادیتی ہے جو انصاف کی آواز بلند کرنا چاہتا ہے۔

آج امریکا، برطانیہ اور مسیحی دنیا ان یہودیوں کو کیا صرف اس لیے پہچان نہیں پاتی کہ اب وہ یہودی نہیں بلکہ صہیونی بن گئے ہیں، آخر یورپ سے سارے یہودی دفاتر ۱۹۴۰ء تک نیویارک کیوں منتقل کر دیے گئے؟ صہیونیت کا ارتقاء کن سازشوں کا رہین منت ہے۔ ایسے سوالوں کے جواب کے لیے کتابیں کم نہیں، لیکن ان چند سطروں کے لیے سب سے کارآمد ۱۹۷۶ء میں چھپی ہارورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر حبیب الحق ندوی کی کتاب فلسطین اور بین الاقوامی سیاست ثابت ہوئی۔ ذلت و مسکنت کی عادی قوم اور اس کے کار فساد فی الارض کی معاون کچھ اور نسل پرست تنظیموں کا اصل چہرہ سامنے لایا جائے تو غزہ و فلسطین کی سچائی سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوسکتی۔

***

گذشتہ دنوں دو نہایت افسوس ناک خبریں آئیں جن سے بڑھتی جاتی ویرانی کی وحشت میں اور اضافہ ہوا، پہلے خبر آئی کہ مظاہر علوم سہارنپور کے منتظم اعلیٰ اور خانوادہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے رکن رکین مولانا شاہد صاحب نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، علم کے ساتھ وہ اخلاق کا بھی بڑا خوبصورت نمونہ تھے۔ اس لیے مقبولیت کے درجہ بلند پر فائز ہوئے۔ دوسری خبر جناب شارب ردولوی کے سانحہ ارتحال کی ہے، موجودہ اردو ادب میں بحیثیت ادیب و نقاد ان کی شخصیت بڑی غنیمت تھی، اور اس سے بھی زیادہ وہ اودھ کی قدیم اور مٹتی ہوئی شرافت و ثقافت کی وہ تصویر تھے۔ علم، ادب، تہذیب، ثقافت اور صدیوں کی روایت کے یہ نمونے اٹھتے جاتے ہیں، ایک عجب فضا ہے جس میں بس اداسی کا رنگ ہے۔ اللہ رحم فرمائے ان پر جو چلے گئے اور ان پر جن کو وراثت کی ذمہ داری ملی ہے۔

***

دارالمصنّفین کے ناظم اور مدیر معارف ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب اس وقت اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ دائیں پیر میں انفیکشن ہو گیا تھا، جس کا آپریشن ہوا ہے۔ قارئین سے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

***

# بین المذاہب مکالمہ: عصر حاضر کا تقاضا

ارشید احمد شیخ

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ (کشمیر)

arshidijt84@gmail.com

اسلام ایک آفاقی دین ہے جس نے صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ پوری انسانیت کو ایک قوم قرار دیا ہے۔ اسلام کی رو سے اتحاد و اتفاق بین المسلمین لازمی ہے۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کو اسلام نے خواہ وہ عجمی ہوں یا عربی، گورے ہو یا کالے، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، جسد واحد قرار دیا ہے۔ اسلام تکریم مسلمان ہی کا نہیں بلکہ تکریم انسانیت کا داعی ہے۔ اسلام نے ایک مسلمان کی جان، مال اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام کی ہے یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان، مال عزت کا محافظ ہے نہ کہ غاصب۔ مگر اس وقت جو مسلمانوں کی حالت ہے وہ بہت ہی پریشان کن ہے۔ مسلمان ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک قبلہ کو ماننے والے مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ یہ مختلف فرقے مسلمانوں میں آپسی لڑائی اور نفرتوں کی اصل وجہ ہے۔

اسلام میں اتحاد کی اہمیت کیا ہے یہ کسی سے مخفی نہیں۔ قرآن کریم نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔ اس طرح اسلام نے ان تمام وحدتوں کو توڑا جو نسب، خاندان، رنگ یا وطن کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی اور تمام انسانوں کو اللہ اور دین کی وحدت پر جمع کیا جو نا قابل تقسیم ہی نہیں بلکہ لازوال بھی ہے۔ اسلام میں اتحاد کی اہمیت کیا ہے یہ کسی سے مخفی نہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کو بلکہ پوری انسانیت کو ایک قوم ایک خاندان میں جوڑا ہے جو نا قابل تقسیم ہے۔ قرآن کریم نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔ اس طرح اسلام نے ان تمام وحدتوں کو توڑا جو نسب، خاندان، رنگ یا وطن کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی[1]۔

قرآن حکیم نے اس سلسلے میں نہایت واضح الفاظ میں ہدایت دی ہے کہ وہ ہر حال میں اتحاد و اتفاق کے دامن کو تھامے رکھیں اور تفرقہ میں نہ پڑے مثلاً:

---

[1] وحدت امت، مولانا مفتی محمد شفیع، مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۶

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (النساء:۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ وقرابت کے تعلّقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (آل عمران:۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل وکرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (الانفال:۴۶)

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (الانبیاء:۹۲)

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ (الشوری:۱۳)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جسے (اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی

ہدایت ہم ابراہیم (علیہ السلام) اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

اختلاف رائے ایک فطری بات ہے اور یہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ انتظامی معاملات میں تو اختلاف رائے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں بھی رہا اور پھر خلفائے راشدینؓ کے عہد میں بھی۔ اختلاف رائے کے کچھ حدود ہیں۔ اگر اختلاف رائے ان حدود کے اندر ہو تو وہ نقصان دہ نہیں ہے بلکہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ مختلف آراء ہونے کے باوجود اپنے مخالف کی رائے کو توقیر کی نظر سے دیکھنا صرف ان مسائل میں ہے جن کا قرآن وسنت میں کوئی تذکرہ نہیں ہے یا تذکرہ تو ہے مگر اجمالی یا ابہام کے ساتھ یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر اختلاف ہو۔[2] جمہور علماء کے نزدیک اجتہادی اختلافات میں دو مختلف آراء میں سے ایک صحیح اور ایک خطا ہوتی ہے۔ مگر یہ یقینی طور پر کون سی رائے صحیح ہے اس کا پیمانہ کسی کے پاس نہیں۔ ایک رائے ایک مجتہد کے نزدیک صحیح ہو سکتی ہے مگر اس میں خطا ہونے کا احتمال بھی ہے۔ لہذا فروعی مسائل میں کوئی رائے حتمی نہیں ہے۔[3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی اختلافات تھے پھر بھی وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے کیونکہ انہوں نے اسلام کو سمجھا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ اسلام میں اتحاد کی کیا اہمیت ہے اور تفرق اور انتشار کو اسلام کتنا ناپسند کرتا ہے۔

ان حالات میں امت مسلمہ پر بالعموم اور علمائے اسلام پر بالخصوص کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے اس کا جواب بھی ہمیں قرآن حکیم نے بتایا ہے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ[4]

کہو، اے اہل کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم

---

[2] ماخذ سابق، ص ۹-۱۲

[3] ماخذ سابق، ص ۱۸

[4] آل عمران: ۶۴

اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے.......اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو۔ ہم تو مسلم صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے ہیں۔

اس آیت کی شرح میں ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''یہ حکم عام ہے اس میں یہود و نصاری بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جو انہی جیسے ہوں''، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جن سے اشتراک ممکن ہو۔ بظاہر یہاں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سب علمائے اسلام سے یہاں خطاب ہو رہا ہے کیونکہ آخرت کو مانتے ہیں، فرشتوں کو مانتے ہیں، تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم کو اللہ تعالی کی آخری کتاب تسلیم کرتے ہیں وغیرہ۔ اس سے علمائے اسلام کو یہ درس بھی ملتا ہے کہ وہ فروعی اور نظریاتی اختلافات سے بالاتر ہو کر اصل مقصد حیات یعنی اقامت دین اور اشاعت دین کے لیے مل کر جدوجہد کریں۔ واضح رہے یہ وہ چیزیں ہیں جو امت کو موجودہ زبوں حالی اور پستی سے نکال سکتے ہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

جس امت کو اسلام نے بنیان مرصوص قرار دیا تھا آج وہی امت انتشار کی شکار ہے۔ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئی ہے جو ایک دوسرے سے بیزار اور برسرپیکار ہیں۔ اس تفرق کی بنیاد سیاسی پارٹیاں ہیں، نسبی برادریاں ہیں، مختلف کاروبار ہیں، امیر وغریب کی تقسیم ہے اور سب سے بڑھ کر مسلک پرستی ہے۔ اس مسلک پرستی نے امت کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان برسرِپیکار ہیں۔ مسلمانوں کی ہر تنظیم اور ہر اجتماع اس کو بھڑکانے میں لگا ہوا ہے۔ اس وبا نے مسلمانوں کے دین و دنیا کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس مسلک پرستی کے غلو میں لوگوں نے بلکہ اہل علم نے دوسرے مسالک کے علماء کو گمراہ اور کافر قرار دیا اور ان کے ماننے والوں کو بھی گمراہ قرار دیا اور یہ سب کچھ وہ دین کی خدمت کے نام پر کرتے ہیں۔[5] امت میں افتراق و تفرق کم کرنے یا ختم کرنے کا طریقہ اسلام نے خود بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ خیر کی طرف دعوت حکمت وتدبیر، خیر خواہی و ہمدردی اور نرم گفتگو کے ذریعے دی جائے اور پھر آخر میں حجت و دلیل کے ذریعے افہام و تفہیم کی راہ ہموار کی جائے۔ مگر اس قیمتی جوہر کو آج کے اہل علم نے فراموش کیا ہے جیسا کہ یہ ہے ہی نہیں۔[6] مسلمانوں کی دینی جماعتیں جو تعلیم وتربیت، دعوت و تبلیغ اور

---

[5] وحدت امت، مولانا مفتی محمد شفیع، مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۷-۸

[6] ماخذ سابق، ص ۲۱

اصلاح معاشرہ کے لیے وجود میں آئی ہیں۔ ان میں علماء، صلحاء اور مخلصین کی اچھی خاصی تعداد کام کر رہی ہیں۔ اگر امت کا یہی طبقہ باہم مل کر دین میں انتشار کی ذریعے پڑنے والی فتنوں کی پرواہ کر لیں اور مقدور بھر آپس میں ایک دوسرے کو تعاون کرنے لگے اور اقامت دین کے خاطر ہر مکتبہ فکر ایک دوسرے کو اپنا معاون و مددگار سمجھے اور دوسروں کے کام کی اسی طرح قدر کرے جس طرح اپنے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو الگ الگ نظاموں میں ہونے کے باوجود یہ مختلف مکتب فکر کے لوگ اسلام کے لیے ایک قوت ثابت ہو سکتے ہیں۔[۷]

مسلکی اختلافات سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کو ایک دوسرے مسالک کا احترام کرنا چاہیے اور آپس میں بھائی بن کر رہنا چاہیے۔ کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دینا چاہیے جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی اور رسول تسلیم کرتا ہے۔ اگر آپ کو لگ رہا ہے کہ کوئی مسلمان بھٹکا ہوا ہے یا گمراہ ہے یا اس کا مسلک ٹھیک نہیں ہے تو آپ اسے محبت بھرے انداز میں اور نرمی کے ساتھ دعوت دیں اس منہج کی طرف جسے آپ حق سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ مساجد میں مل کر نماز ادا کرے، ایک دوسرے کے جنازوں میں شرکت کرے اور ایک دوسرے کے ہاں رشتہ کریں تاکہ نفرتیں اور عداوتیں دور ہوں اور دنیا کو یہ پیغام ملے کہ امت مسلمہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے اسلام اسی کا ہمیں درس دیتا ہے۔[۸]

مختلف مسائل کے علماء و مصلحین کو چاہیے کہ وہ ایک میز پر بیٹھے اور مختلف فیہ مسائل پر خلوص نیت سے، نرمی سے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے بات چیت کریں اور ایک معتدل اور درمیانی راستہ نکالیں تاکہ امت میں فتنہ و فساد کا دروازہ بند ہو جائے اور بین المسالک اتحاد و اتفاق کی فضا قائم ہو جائے۔ اسی میں امت کی بقا ہے اور نجات بھی۔

امت مسلمہ میں جتنے بھی فرقے اور مسالک ہیں ان میں شدید اختلافات ہونے کے باوجود بہت ساری چیزوں میں اتفاق بھی ہے مثلاً اللہ تعالی پر ایمان، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان، آخرت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، سارے انبیاء پر ایمان اور قرآن مجید پر ایمان کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے۔[۹] ان سخت حالات میں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان آپسی اختلافات کو بھلا کر ساری توجہ ان اصولوں پر دیں جو سب مسالک

---

[۷] ماخذ سابق، ص ۲۶

[۸] وحدت امت، مولانا محمد اسحاق، مکتبہ ملیہ، فیصل آباد، ص ۶۱–۶۲

[۹] ۔اتحاد امت کیسے ممکن ہے، پروفیسر محمد حبیب اللہ چستی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۱

میں یکساں ہیں تاکہ ہماری تمام تر صلاحیتیں اصل مقاصد پر صرف ہوں نہ کہ دوسرے مسلمانوں کو کافر و مشرک ثابت کرنے میں اور امت مسلمہ سکون و چین سے جیے اور دنیا کو بھی امن و سلامتی کا درس دے اور ظلم و ستم کو بھی خیر آباد کہے جو دنیا میں اس وقت برپا ہے۔"[۱۰]

اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے معبودوں پر سبّ و شتم نہ کرے۔ واضح رہے جو دین دوسرے مذاہب کی بتوں کو سبّ و شتم کرنے سے روکتا ہے وہ مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ایک دوسرے کے اکابر پر سبّ و شتم کرے اور امت میں فتنہ و فساد برپا کرے۔ اسلام فساد فی الارض کا روادار نہیں ہے۔ اسلام مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ یہود و نصاری کی طرح نہ بننا جو مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور جنہوں نے واضح نشانیاں آجانے کے بعد اختلاف کیا۔ اس کے برعکس اسلام مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ وہ آپس میں بھائی بن کر رہے، ایک دوسرے کے خیر خواہ بنے اور اتحاد و اتفاق کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھے۔ سب سے زیادہ ذمہ داری علمائے اسلام پر ہے خواہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہو کہ وہ بیٹھ کر آپس میں بات چیت کریں، ایک دوسرے سے تعاون کرے اور آپسی دشمنیوں اور نفرتوں کو مٹائے تاکہ امت میں محبت و الفت، رواداری اور پر امن فضا قائم ہو سکے۔

امت میں انتشار کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مسلک دوسرے مسالک کے علماء، صلحاء اور مصلحین پر سبّ و شتم، طنز و استہزاء کرتا ہے۔ اس آپسی سبّ و شتم، طنز و استہزاء نے مسلمانوں میں ایک دوسرے کی محبت ختم کر دی اور آپسی دشمنیوں، نفرتوں اور عداوتوں کا دروازہ کھول دیا۔ ایک دوسرے پر تنقید و تنقیص کرتے ہوئے اور کفر و شرک کا فتوی لگاتے ہوئے مسلمانوں کو یہ حقیقت نظروں سے کیوں اوجھل ہوتی ہے کہ تحریر و تقریر کا واحد مقصد بھٹکے ہوؤں اور گمراہوں کو راہ راست پر لانا ہے نہ کہ مزید دور کرنا۔ اگر ایک مسلک کے علماء کو لگتا ہے کہ دوسرے مسالک کے لوگ صراط مستقیم سے دور ہو رہے ہیں تو انہیں برا بھلا کہنے سے وہ مزید دور ہوں گے۔ لہذا علمائے اسلام پر ان حالات میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مدلل اور شائستہ طریقے سے ایک دوسرے کو جواب دیں تاکہ بھٹکے ہوئے انسان کو سیدھی راہ دکھائی دے۔ واضح رہے بھٹکا ہوا انسان آپ کی شفقت اور توجہ کا زیادہ مستحق ہے۔[۱۱]

---

[۱۰] ماخذ سابق، ص ۲۷-۲۸

[۱۱] ماخذ سابق، ص ۵۳-۵۵

# مسلم خواتین کی قرآنی خدمات و مطالعات کا ظہور و ترقی: ایک مطالعہ

عشرت نبی

ریسرچ اسکالر، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر

malikishrat139@gmail.com

اسلام کا مرکزی متن اور بنیادی ماخذ ہونے کے ناطے، قرآن کو مسلمان پوری انسانیت کے لیے اور خاص طور پر اس پر ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن پر ایمان لانے والے لوگ روحانی، قانونی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، سماجی غرض اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے بنیادی تقاضوں میں سے کچھ اہم تقاضے یہ ہیں کہ قرآن اور اس کے پیغام کو سمجھا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ زمین پر اللہ کے بندے اور نائب ہونے کی حیثیت سے مسلمان مردوں کی طرح مسلمان خواتین نے بھی شروع سے ہی قرآن کا مطالعہ، اس کی تفسیر، اس کی حفاظت اور اسے دوسروں تک منتقل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزار سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر علمی شعبوں کی طرح مطالعات قرآن کے میدان میں بھی مردوں کی تحریریں خواتین کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلم خواتین نے ماضی یا دور حاضر میں اس میدان میں سرے سے ہی کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ اور موجودہ دور میں ایسی بہت سی خواتین ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طریقے سے مطالعات قرآن کے میدان میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ اس مقالے میں رسول اللہ ﷺ کے دور سے لے کر موجودہ دور تک کی ایسی ہی چند خواتین کا تذکرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

**تعارف:** مطالعات قرآن کا شعبہ متعدد شاخوں پر پھیلا ہوا ہے جس میں دیگر شاخوں کے ساتھ ساتھ قرآن کے مندرجات کا مطالعہ، قرآن کا ترجمہ و تفسیر، قرآنی علوم کا مطالعہ، علم قرأت وغیرہ شامل ہیں۔ اسلام میں قرآن کی مرکزیت کو مد نظر رکھتے ہوئے، مسلمان خواتین نے، قرآن کے مطالعہ اور اس کے معانی کی تلاش و تحقیق میں گہری دلچسپی لی۔ قرآن کے ساتھ اس تعلق کی ایک وجہ مسلمان عورتوں کا قرآن میں دیے گئے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا بھی ہے جس میں اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کی ازواج کو حکم دیا ہے کہ ان کے گھروں میں اللہ تعالی کی آیات اور حکمت میں سے جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسے

یادرکھیں اور محفوظ رکھیں (القرآن ۴۳:۳۳)۔ یہ حکم اگرچہ نبی اکرم ﷺ کی ازواج کو دیا گیا تھا تاہم دیگر مسلم خواتین نے ازواج مطہرات سے فیض پاکر قرآن کو یاد کرنا، سمجھنا، محفوظ کرنا، اس کے مطابق زندگی گزارنا اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچانا اپنی ذمہ داری سمجھا۔ یہ سلسلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں شروع ہوا اور ابھی تک جاری ہے۔ اگرچہ اسلامی تاریخ کی پہلی چند صدیوں کے بعد اس میدان میں مسلم خواتین کی شرکت میں کمی واقع ہوئی لیکن مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ بہت ساری مسلم خواتین اسکالرز ایسی تھیں اور اب بھی موجود ہیں جنہوں نے مختلف طریقوں سے قرآنی خدمت میں اہم رول نبھایا۔ یہ تحریر ان میں سے چند کو پیش کرنے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔

**دور جدید سے پہلے قرآنیات میں مسلمان خواتین کی خدمات:** عہد نبوی ﷺ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مردوں کے ساتھ ساتھ مسلمان خواتین بھی قرآن کی تعلیم حاصل کرنے میں برابر کی شریک رہیں اس کی دلیل اس تاریخی واقعہ سے ملتی ہے کہ جب قبول اسلام کے وقت خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب اپنی بہن فاطمہؓ بنت الخطاب کے گھر تشریف لے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بہن اپنے شوہر سعید بن زید کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی خباب بن ارت سے قرآن کا درس لے رہی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تفسیر سے متعلق روایات کو بیان کرنے میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قرآن کی تفسیر سے متعلق بہت سی روایات ایسی ہیں جن کا امت تک پہنچانے کا سہرا مسلمان خواتین کے سر جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور صلاحیت کی مالک تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر انہوں نے حدیث وسنت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا بھی کافی گہرا علم حاصل کر لیا تھا۔ قرآن کو سمجھنے اور اس کی تفسیر کرنے کا ان کا ایک منفرد انداز تھا۔ ان کا علم صرف احادیث کی روایت کرنے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ احادیث کی تنقیدی توثیق کرنے میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ قرآن کے بارے میں ان کا علم اتنا گہرا تھا کہ وہ قرآن کی میزان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منسوب روایات یا احادیث کی صحت کو جانچتی اور ان کا تجزیہ کرتی تھیں۔ ان کی قرآن کی مختلف آیات کی تفسیر مشہور مفسرین جیسے طبری، ابن کثیر، السیوطی وغیرہ کی تفاسیر میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بعض کتابیں مکمل طور پر ان کی تفسیر قرآن سے متعلق روایات کو جمع کرنے کے لیے مختص کی

گئیں ہیں۔ مثال کے طور پر مرویات ام المومنین عائشہ فی التفسیر جو سعود بن عبداللہ الفنیسان نے ۱۹۹۲ء میں اور تفسیر ام المومنین عائشہ، جو عبداللہ ابو السعود بدر نے ۱۹۹۶ء میں مرتب کی ہے[1]۔ ام المومنین حضرت ام سلمیٰ قرآن اور اس کی روایات کو سنجیدگی سے لیتی تھیں۔ قرآن کو گہرائی سے سیکھنے کا ان کا تجسس و شوق اور اس کے مختلف زاویوں کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا استفسار قرآن کی بہت سی آیات کے نازل ہونے کا سبب بنا۔ قرآن کی تفسیر سے متعلق ان کی بہت سی روایات سنن الترمذی میں موجود ہیں۔[2] ایک اور صحابیہ ام ورقہ نے پورا قرآن حفظ کیا تھا[3] اور دیگر صحابیات نے اس کے کچھ حصوں کو اپنے حافظہ میں محفوظ کیا تھا۔ جمیلہ بنت سعد جسے ام سعد بن سعد بن ربیع کے نام سے جانا جاتا ہے قرآن پاک پر لیکچر دیا کرتی تھیں۔[4] قرآن کو سمجھنے اور اس کی تفسیر کرنے کا مسلمان خواتین کا طریقۂ کار وہی رہا جو اس زمانے کے مردوں کا رہا یعنی تفسیر قرآن بالقرآن: قرآن کے ایک حصہ کو اس کے مشابہ دوسرے تفصیلی حصے کے ذریعہ تفسیر کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعہ قرآن کی آیات کی وضاحت کرنا، نازل شدہ آیات کے سیاق و سباق کو سمجھ کر اور لسانی اور قواعد کے اصولوں کو استعمال کر کے قرآن کی تفسیر کرنا۔ صحابیات کے بعد تابعات بھی اسی راستے پر چلیں جس کی نظیریں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قائم کی تھیں۔ ان میں ایسی خواتین بھی موجود تھیں جو علم قرأت، علم التجوید اور قرآن کی تفسیر میں مہارت رکھتی تھیں۔ مثال کے طور پر حفصہ بنت سیرین (متوفی ۱۰۱ھ) قرآن کی اسکالر اور علم قرأت میں ماہر تھیں۔ مشہور تابعہ ام الدرداء الصغراء فقہ میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ علم قرأت پر بھی عبور رکھتی تھیں۔[5] نفیسہ بنت حسن (متوفی ۲۰۸ھ) امام جعفر الصادق کی بہو اور مشہور فقیہ امام شافعی کی استاد تفسیر اور حدیث دونوں کی عالم تھیں۔ انہوں نے پورا قرآن حفظ کر

---

[1] نور سعدہ حمیسن، نوار دتن رزلی۔ ویمنز کنٹریبوشن ان دی قرآنک ایگزجسز: اشوز اینڈ انلسز، قرآن بحیثیت بنیاد تہذیب پر چھٹی بین الاقوامی کانفرنس کی پرسیڈنگز، ایس-ڈبلیو-اے-ٹی ۲۰۱۹

[2] سحر عنبرین، خواتین اور خدمت قرآن۔ ہدایت پبلشرز اور ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی ۲۰۱۹ء، ص ۶۶-۶۷

[3] ابن اثیر، جیسا کہ نقل کیا ہے طالب الہاشمی نے، تذکار صحابیات، البدر پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۸۷

[4] ابن اثیر، جیسا کہ نقل کیا ہے طالب الہاشمی نے تذکار صحابیات، البدر پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء ص ۴۴۶-۴۴۷

[5] ابن الجزاری، جیسا کہ نقل کیا ہے رضی الاسلام ندوی نے، اسلامی علوم میں خواتین کی خدمات۔ مرکزی مکتبہ، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۵

رکھا تھا۔ تاریخ میں وہ نفیسۃ العلم کے نام سے جانی جاتی ہیں[6]۔ ایک اور مشہور نام چوتھی صدی کی اسکالر فاطمہ نیشاپوریہ (متوفی ۳۲۳ھ) کا ہے۔ وہ قرآن کی مفسر اور حافظہ تھیں۔ وہ صاحب علم قرأت اور فقیہ ہونے کی وجہ سے بھی مشہور تھیں۔ تاریخ میں انہیں مفسرہ فاطمہ نیشاپوریہ کے نام سے پکارا جاتا ہے[7]۔ ڈاکٹر اکرم ندوی نے اپنی مشہور کتاب ''المحدثات: دی ویمن اسکالرز ان اسلام'' (۲۰۰۷ء) میں مزید خواتین اسکالرز کا تذکرہ کیا ہے جو قرآنی علوم کے شعبے میں ماہر تھیں۔ جیسے امۃ الواحد بنت الحسین بن محمد الدبی المحامیلی (متوفی ۳۷۷ھ)، انہوں نے قرآن حفظ کیا تھا اور عربی زبان اور قواعد میں مہارت رکھتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فقہ کو مکتب امام شافعی کے مطابق سیکھا تھا[8]۔ پانچویں صدی ہجری کی ام سعد اسماء بنت احمد بن عبد اللہ بن احمد البحرانیہ نے قرآن کے علم ناسخ و منسوخ میں مہارت حاصل کی تھی[9]۔ فاطمہ بنت ابی علی الدقاق النساپوریہ (متوفی ۴۸۰ھ) خدا کی کتاب کی عالم اور نیک خاتون تھیں[10]۔ ام الخیر فاطمہ بنت ابی الحسن علی ابن المظفر البغدادیہ (متوفی ۵۳۲ھ) ایک عظیم عالم اور قرأت قرآن میں ماہر تھیں[11]۔ اسی طرح ام العز بنت محمد بن علی بن ابی غالب العبدری الدانی (متوفی ۶۱۰/۶۱۷ھ، خدیجہ بنت ہارون (متوفی ۶۹۵ھ)، خدیجہ بنت قائم البغدادیہ (متوفی ۶۹۹ھ) علم قرأت میں مشہور تھیں اور بہت سارے لوگوں نے ان میں سے مؤخر الذکر خاتون سے قرأت اور تجوید کا علم حاصل کیا[12]۔ ایک اور مشہور خاتون عالم جنہوں نے علوم قرآن میں کمال حاصل کیا وہ سیدہ بنت عبد الغنی الغرناطیہ تھیں۔ اسی طرح نویں صدی ہجری کی سلمی بنت محمد الجزری، فاطمہ بنت محمد، بیرم بنت احمد بن محمد الدیروتیہ، فاطمہ بنت الشمس ابن الصائغ اور فاطمہ بنت شمس الدین محمد بن یوسف الدیروتی کو علم

---

[6] ابن الجزاری، جیسا کہ نقل کیا ہے رضی الاسلام ندوی نے، اسلامی علوم میں خواتین کی خدمات۔ مرکزی مکتبہ، دہلی: ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

[7] سحر عنبرین، خواتین اور خدمت قرآن۔ ہدایت پبلشرز اور ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۹

[8] الذہبی، جیسا کہ نقل کیا ہے اکرم ندوی نے، المحدثات: دی ویمن اسکالرس ان اسلام، انٹرفیس پبلیکیشنز، لندن: ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۲

[9] اکرم ندوی، المحدثات: دی ویمن اسکالرس ان اسلام، انٹرفیس پبلیکیشنز، لندن: ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۳

[10] ماخذ سابق، ص ۲۷۵

[11] ماخذ سابق ص ۱۱۷

[12] رضی الاسلام ندوی، اسلامی علوم میں خواتین کی خدمات۔ مرکزی مکتبہ، دہلی: ۲۰۱۸ء ص ۱۶

قرأت میں عبور حاصل تھا۔ان میں سے آخر الذکر عورت نے قرأت کے فن پر ''الشاطبیہ'' نامی کتاب حفظ کی اور یہ فن مردوں اور عورتوں دونوں کو سکھایا۔ایسی دوسری خواتین بھی ہیں جنھوں نے قرآن کے بعض علوم میں مہارت حاصل کی جیسے عائشہ بنت عبدالرحیم بن محمد بن احمد بن الزجاج نے اپنے اساتذہ سے ابو بکر محمد بن عزیز السجستانی کی کتاب ''غرائب القرآن'' اور ابو عبداللہ محمد بن ایوب البجلی کی ''فضائل القرآن'' کی تعلیم حاصل کی، ضوء الصباح عجیبہ البقداریہ البغدادیہ (متوفی ۶۴۷ھ) نے البجلی کی ''فضائل القرآن''، ابو بکر الآجوری کی کتاب ''اخلاق حملۃ القران'' اور محی السنۃ البغوی کی ''مشکل القرآن العظیم'' پڑھی اور سیکھی تھیں[۱۳]۔

بعد میں نویں صدی ہجری کے بعد اگرچہ مسلمان دنیا کو فکری زوال کا سامنا کرنا پڑا تاہم مطالعات قرآن میں ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ بعض اسکالرس کی رائے میں اس دور میں مسلمان دنیا میں خواتین کی تعلیم صرف شاہی اور اشرافیہ کے طبقے تک محدود تھی۔اس زمانے میں مطالعات قرآن میں جن خواتین نے دلچسپی کا مظاہرہ کیا ان میں چند کے نام یہ ہیں: مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء جنھوں نے پورا قرآن حفظ کیا تھا، بران بنت محمد اثیر الدین انہوں نے بھی قرآن کا مطالعہ کیا تھا (متوفی ۹۳۸ھ)، شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے تجوید اور قرأت کا فن سیکھا، خناثہ بنت بکار ابن علی المعافری (متوفی ۱۱۵۹ھ) قرآن کی سبع قرأت کی ماہر تھیں[۱۴]، دانیال ولد اکبر کی بیوی جانان بیگم نے بعض مصنفوں کے مطابق قرآن کی فارسی تفسیر لکھی[۱۵]۔خدیجہ بنت احمد بن الفاسیہ (متوفی ۱۳۲۳ھ) امۃ اللہ بنت عبدالغنی الدہلویہ (متوفی ۱۳۵۷ھ)، شمس النساء بنت عامر حسن الشہسوانی (متوفی ۱۳۰۸ھ) وغیرہ۔[۱۶]

**جدید دور میں مسلمان خواتین کی قرآنی خدمات کا ارتقاء:** جدیدیت کے ظہور اور بڑے پیمانے پر خواندگی کے عروج کے ساتھ، مسلمان خواتین اسکالرز کی ایک بڑی تعداد نے قرآن کو صرف سیکھنے اور منتقل کرنے کے بجائے قرآن کی تفسیر کرنے میں براہ راست حصہ لے کر تصنیف کے میدان میں قدم رکھا اور دیگر علوم کے ساتھ ساتھ قرآن کے علوم جیسے تفسیر اور تراجم وغیرہ میں کئی اہم تصانیف پیش کیں۔

---

[۱۳] اکرم ندوی، المحدثات: دی ویمن اسکالرز ان اسلام، انٹر فیس پبلیکیشنز، لندن: ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۵

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۱۱۹-۱۲۰

[۱۵] سید محمد سلیم، مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات، ذکری انٹر نیشنل پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴

[۱۶] اکرم ندوی، المحدثات: دی ویمن اسکالرز ان اسلام، انٹر فیس پبلیکیشنز، لندن، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۲۱-۱۲۲

ان میں سے کچھ قابل ذکر خواتین جنھوں نے تفسیر کے میدان میں کام کیا یہ ہیں: سیدہ نصرت بیگم امین (۱۹۸۳-۱۸۸۶ء)، ایرانی شیعہ عالمہ، فقیہہ اور مفسرہ جسے بانو امین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، نے ''مخزن العرفان در تفسیر قرآن'' کے عنوان سے پندرہ جلدوں کی فارسی تفسیر لکھی۔ مصری اسکالر عائشہ عبدالرحمن (۱۹۱۳-۱۹۹۸) جو بنت الشاطی کے نام سے مشہور ہے، نے قرآن کی تفسیر پر مبنی کئی کتابیں تحریر کیں۔ ان میں سے دارالمعارف قاہرہ مصر سے شائع ہونے والی ان کی تفسیری کتابوں میں سے کچھ یوں ہیں: ''التفسیر البیانی للقرآن الکریم'' (جلد ۱: ۱۹۶۲ء، جلد ۲: ۱۹۶۹ء)، ''مقال فی الانسان دراسۃ القرآنیہ'' (۱۹۶۹ء)، ''القرآن والتفسیر العصری: ھٰذا بلاغ للناس'' (۱۹۷۰ء)، ''الاعجاز البیانی للقرآن و مسائل ابن الازرق'' (۱۹۷۱ء)[۱۷] اور بہت سی دوسری کتابیں شائع کیں جنھوں نے مصر اور عرب دنیا میں ان کی پہچان بنائی۔ ایک اور مصری خاتون کارکن اور مفسر زینب الغزالی (۱۹۱۷-۲۰۰۵ء) تھیں۔ انہوں نے ''نظرات فی کتاب اللہ'' کے عنوان سے ایک مکمل تفسیر لکھی۔ دوسری مصری مفسر کریمان حمزہ نے ''اللولو والمرجان فی تفسیر القرآن'' لکھی جس کو اشاعت سے قبل جامعہ الازہر سے منظوری بھی حاصل ہوئی۔ فلسطینی اسکالر نائلہ ہاشم صبری (پیدائش: ۱۹۴۴ء) نے سولہ جلدوں میں ''المبصر لِلنور القرآن'' کے عنوان سے قرآن کریم کی مکمل تفسیر لکھی۔ شامی اسکالر حنان اللحام (پیدائش: ۱۹۴۳ء) نے قرآن مجید کی کئی سورتوں کی تفسیر لکھی جن میں سے تیرہ سورتیں ''سلسلۃ النظرات فی کتاب اللہ '' کے عنوان سے شائع ہوئیں[۱۸]۔ ترک اسکالر سمرہ کورون چیکگل (پیدائش: ۱۹۴۷ء) نے ترکی زبان میں تفسیر تصنیف کی جسے ''تفسیر القاری'' یا '' قاری کی تفسیر'' بھی کہا جاتا ہے۔ فوقیہ شربینی نے ۲۰۰۶ء میں ''تیسیر التفسیر'' کے نام سے قرآن کی تفسیر مرتب کی۔ قطر میں پیدا ہونے والی کاملہ نے مختلف اسلامی علوم جیسے فقہ، دینیات وغیرہ پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ تفسیر کے میدان میں انہوں نے ''تفسیر غریب القرآن'' لکھی جس میں انہوں نے قرآن کے ان الفاظ کی تفسیر پر غور کیا جو آسانی سے

---

[۱۷] دامین، اے اسٹڈی آف بنت شاطیز ایگز جسز، ایم اے ڈزیرٹیشن، میک گل یونیورسٹی مونٹریال، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱-۱۹

[۱۸] ہدایت ایدر، محمد اتالے، فمیل اسکالرز آف قرآنک ایگزیجسز ان دی ہسٹری آف اسلام، جرنل آف تھیالوجی فیکلٹی آف بلنٹ اجوت یونیورسٹی، جلد (۱) نمبر (۲) ۲۰۱۴ء، ص ۱۹

سمجھ میں نہیں آتے ہیں[19]۔ مذکورہ بالا خواتین قرآن کریم کی تفسیر کرنے کے اس سفر میں تنہا نہیں ہیں بلکہ مسلسل اور خواتین ان کے ساتھ جڑتی جا رہی ہیں اور بخوبی اپنا کردار نبھا رہی ہیں۔

ماڈرن ازم اور اس کی شاخ تانیثی تحریک کے زیرِ اثر بعض مسلمان خواتین اسکالرز نے یہ بحث اٹھائی کہ تقریباً قرآن کی تمام تفسیریں مردوں کے ذریعہ سے لکھی گئی ہیں اور ان تفاسیر میں پدر شاہیت کا غلبہ پایا جاتا ہے اور یہی تفاسیر مسلمان خواتین پر ظلم و تشدد کی ذمہ دار ہیں۔ اس لئے انہوں نے نسائی نقطہ نظر سے قرآن کی دوبارہ تشریح یا اس کی تفسیر پر نظر ثانی کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں انہوں نے خاص طور پر قرآن کی ان آیات پر روشنی ڈالی جو خواتین اور ان کے مسائل سے متعلق ہیں۔ مزید انہوں نے مرد اور عورت کی مساوات اور قرآن کی تفسیر کرنے کے طریقہ کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں آمنہ ودود نے کتاب "قرآن اینڈ ویمن: ری ریڈنگ دی سیکرڈ ٹیکسٹ فرام اے وومنز پرسپیکٹیو" جو پہلی بار ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی اور اسماء برلاس نے "بلیونگ ویمن ان اسلام: انریڈنگ پیٹریارکل انٹرپریٹیشنز آف دی قرآن" جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی لکھی ہیں۔ عائشہ ایس چوہدری نے اپنی پوری کتاب "ڈمسٹک وویلنس اینڈ دی اسلامک ٹرڈیشن" جو کہ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی، کو قرآن کی سورۃ النساء سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۳۴، جسے جدید دور میں متنازعہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ بظاہر شوہروں کو اپنی سرکش اور نافرمان بیویوں کو تادیب کرنے کا حق دیتی ہے، سے متعلق اسلامی تاریخی اور موجودہ اصلاحی اور جدیدیت پسند تشریحات کا وسیع پیمانے پر جائزہ لینے کے لیے وقف کر دیا۔

اس کے مقابلے میں عائشہ اے ہدایت اللہ کی مشہور اور جامع کتاب "فیمنسٹ ایجز آف دی قرآن" قرآن کی نسوانی تشریحات پر تنقید پیش کرتی ہے اور اس بات کا دعوی کرتی ہے کہ قرآن کے بارے میں تانیثیت سے منسلک مفسرین کے دعوؤں کی قرآنی متن سے مکمل تائید نہیں ہوتی۔ مسلمان خواتین اسکالرز کی قرآنی تصنیفات میں زینب علوانی کی کتاب "مسلم ویمن اینڈ گلوبل چیلنجز: سیکنگ چینج تھرو اے قرآنک ٹکسچول اپروچ اینڈ دی پروفٹک ماڈل" جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ قرآن کے متن اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے صنفی تعلقات سے متعلق بنیادی قرآنی اقدار اور قرآنی تصورات پر بحث کی ہے اور اسلامک اسٹڈیز کی ابھرتی ہوئی اسکالر

---

[19] ماخذ سابق، ص ۱۷

سیلین ابراہیم کی ۲۰۲۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع شدہ اور ایوارڈ یافتہ کتاب ''ویمن اینڈ جینڈر ان دی قرآن'' ہے جس میں انہوں نے قرآنی کہانیوں کے ذریعہ قرآنی خواتین شخصیات، ان کی آوازوں پر تبصرہ کیا ہے۔ تفسیر اور ترجمے کے علاوہ مسلمان خواتین نے قرآن کے دیگر پہلوؤں پر بھی لکھا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مشہور کینیڈین اسلامی اسکالر، انگرڈ میٹسن نے قرآن پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے ''دی سٹوری آف دی قرآن: اٹس ہسٹری اینڈ پلیس ان مسلم لائف''۔ یہ کتاب اکیڈمک بیسٹ سیلر تھی اور اسے یو ایس نیشنل انڈومنٹ فار ہیومینٹیز نے ریاستہائے متحدہ کی لائبریریوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ کتاب پہلی بار ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میدان میں مسلم خواتین کی طرف سے لکھی گئی اور بھی بہت سی کتابیں اور تحقیقی مضامین اور مقالے موجود ہیں۔ سحر عنبرین نے ۲۰۱۸ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''قرآنیات میں خواتین کے تحقیقی مقالات'' میں دنیا کے مختلف حصوں جیسے اردن، انڈونیشیا، سوڈان، سعودی عرب، الجزائر، عراق، ملائیشیا، پاکستان، ہندوستان وغیرہ سے تقریباً سات سو مضامین اکٹھے کیے ہیں جو مطالعات قرآن کے میدان میں مسلمان خواتین نے لکھے ہیں۔

**قرآن کی چند مسلمان خواتین مترجمات:** جدید دور نے مسلمان خواتین اسکالرز کے ذریعہ سے قرآن کے قابل قدر اور اہم تراجم بر سر منظر آنے کا بھی مشاہدہ کیا۔ مسلمان خواتین نے قرآن پاک کے متعدد تراجم مختلف زبانوں میں کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں؛ ''دی قرآن: عربک ٹکسٹ ود کورسپوانڈنگ انگلش'' جسے ''صحیح انٹرنیشنل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ تین امریکی نژاد نو مسلم خواتین جنہوں نے بعد میں سعودیہ عربیہ میں رہایش اختیار کی: ایملی اسامی (بعد میں ام محمد)، امۃ اللہ بنٹلی اور میری کینیڈی کا کارنامہ ہے جو ۱۹۹۷ء میں پبلشنگ ہاؤس دار ابوالقاسم سعودیہ عربیہ سے شائع کیا گیا۔ اس ترجمے کو اس کی درستگی، اسلوب اور آسان انگریزی کے لیے سراہا گیا اور قابل ذکر اسلامی اسکالرز اور مبلغین نے اسے پڑھنے کی تجویز دی ہے[۲۰]۔ کیملی ایڈمز ہیلمنسکی نامی ایک امریکی نو مسلم خاتون نے قرآن کے منتخب لیکن اہم حصے کا ترجمہ ''دی لائٹ آف ڈان: ڈیلی ریڈنگز فرام دی ہولی قرآن'' کے نام سے کیا۔ یہ شمبھالہ، بوسٹن سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ قرآن مجید کا جزوی ترجمہ ہے جو قرآن کی ان

---

[۲۰] Available at: Internet Archive 2018. https://archive.org/details/QuranSaheehInternationalTranslationWithMainArabicText (Accessed on 9 September 2022).

آیات کے ترجمہ پر مشتمل ہے جو روزانہ مراقبہ اور روحانی تازگی کے لیے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ 'دی ہولی قرآن انگلش اینڈ پرشین ٹرانسلیشن وید کمنٹری' ایران کی طاہرہ صفار زادہ کا لکھا ہوا دو لسانی (فارسی اور انگریزی) ترجمہ ہے جو پہلی بار ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا[۲۱]۔ ایک اور ترجمہ ایرانی نژاد امریکی اسکالر لیلی بختیار کا 'دی سبلائم قرآن ہے' جو ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ترجمہ قرآن کی سورۃ النساء۴ آیت ۳۴ میں بیان شدہ لفظ 'واضربوھن' جو نشوز کرنے والی عورتوں کے سلسلہ میں آیا ہے جس کا ترجمہ عام طور پر ''ان کو مارو'' کیا جاتا ہے کا مختلف ترجمہ یعنی ''ان سے دور ہو جاؤ'' کرنے کے لئے جانا جاتا ہے[۲۲]۔ ''قرآن مجید: لفظی ترجمہ'' قرآن کا اردو ترجمہ ہے جو پاکستان کی فرحت ہاشمی نے کیا ہے اور الھدی انٹرنیشنل پبلیکیشنز کے ذریعہ سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے[۲۳]۔ ''دی گلوریس قرآن: ورڈ فار ورڈ ٹرانسلیشن'' شہناز شیخ اور کوثر کھتری نے لکھا ہے۔ یہ ترجمہ عربی قرآنی الفاظ کو ان کے انگریزی ترجمے کے ساتھ سیکھنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اسے پہلی بار ۲۰۱۳ء میں شائع کیا گیا تھا۔ کچھ خواتین نے مرد مترجموں کے ساتھ مل کر قرآن کا ترجمہ کیا مثال کے طور پر احمد زیدان اور ان کی اہلیہ دینا زیدان نے مل کر ''دی گلوریس قرآن: ٹکسٹ اینڈ ٹرانسلیشن'' لکھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں کوالالمپور ملائیشیا میں شائع ہوا۔ ''دی نوبل قرآن: ای نیو رنڑرنگ آف اٹس مینگ ان انگلش'' ایک اور قرآن کا ترجمہ ہے جو عبدالحق اور ان کی اہلیہ عائشہ بیولی نے کیا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ''دی قرآن: کمپلیٹ ڈکشنری اینڈ لٹرل ٹرانسلیشن'' قرآن کا ترجمہ ہے جو باپ بیٹی، محمد احمد اور سمیرا احمد نے مل کر کیا ہے[۲۴]۔

---

[۲۱] داؤد تغی پو بازارگانی، اے کمپریٹیو اسٹڈی آن ٹو ٹرانسلیشنز آف دی ہولی قرآن: اے کریٹکل ڈسکورس اینلسز اپروچ، ٹرانسلیشن اسٹڈیز ۱۲، نمبر ۴۸، ۲۰۱۵ء، ص ۵۲

[۲۲] Katie Zavadski, 2017.How Three American Women Translated One of the World's Most Popular Qurans. Daily Beast. Available at https://www.thedailybeast.com/articles/2017/03/25/how-u-s-women-crated-isis-s-favorite-quran (Accessed on 14 September 2022).

[۲۳] Al-Huda International, n.d. Available at: https://www.alhudapk.com/audio/category-1/al-qur-an/translation-and-tafsir/brief-explanation/urdu/dr-farhat-hashmi/dq-2019.html, https://alhamdolillah.com/book/al-quran-translation-by-dr-farhat-hashmi/ (Accessed on 17 September 2022).

[۲۴] Study Quran, n.d. Available at: http://www.studyquran.co.uk/MSAhmed_Koran_translation.htm , (Accessed on 15 September 2022).

ایک اور قرآن کا ترجمہ جو بیوی اور شوہر امۃ الرحمن عمر اور عبدالمنان عمر نے کیا اس کا نام ہے ''دی ہولی قرآن: عربک ٹکسٹ اینڈ انگلش ٹرانلیشن'' اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا[۲۵]۔ قرآن کا ترجمہ بعنوان ''دی قرآن: اے رفارمسٹ ٹرانسلیشن'' کرنے والے تین افراد میں سے ایک خاتون مترجم مارتھا شولٹ ہے۔ باقی دو مترجموں کے نام ہیں اڈپ یوکسل اور لیث صالح الشیبان۔ ان کا یہ ترجمہ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک خاتون اسکالر بنام مسی دقاقے اس ایڈیٹنگ ٹیم کا حصہ تھی جنھوں نے چیف ایڈیٹر سید حسین نصر کے ساتھ مل کر ''اسٹڈی قرآن: اے نیو ٹرانسلیشن اینڈ کمنٹری'' لکھا۔ اور یہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔

**جدید قاریات قرآن:** فن قرأت قرآن، قرآن مجید کی تلاوت کا ایک قدیم اسلامی فن ہے اور یہ ایک اور میدان ہے جہاں مسلمان خواتین نے اپنی ذہانت اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پوری اسلامی تاریخ میں کئی مسلمان مردوں اور عورتوں نے مختلف انداز و اسلوب میں قرآن کی تلاوت کا فن سیکھا اور سکھایا۔ لیکن جدید دور میں اس میدان میں بعض بااثر مسلمان علماء کے خواتین کی آواز کو عورہ یا ستر کی چیز سمجھنے کی وجہ سے اس میدان میں خواتین کو پہنچنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، مثال کے طور پر مصر میں جب ۱۹۳۴ء میں مصری ریڈیو کا آغاز کیا گیا تو وہاں کی شیخہ منیرہ عبدہ اس وقت ریڈیو چینل کی پہلی قاریہ بنی اور لندن اور پیرس کے ریڈیو اسٹیشنوں پر اپنی تلاوت نشر کرکے مقبول ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ میں ان قراء حضرات میں انہوں نے اپنی جگہ بنا لی جن کی اس دور میں بڑی مانگ تھی اور جن کو بہت شوق سے سنا جاتا تھا۔ لیکن وہ اور ان کی دیگر ہم عصر قاریات جیسے شیخہ کریمہ العدلیہ، شیخہ نبویہ النحاس وغیرہ اس کو جاری نہ رکھ سکیں کیونکہ ۱۹۳۹ء میں الازہر کے بعض علماء نے فتوے جاری کیے کہ خواتین کی آواز عورہ ہے، جس کے بعد مصری ریڈیو سے ان کی ریکارڈنگ ہٹا دی گئی، اور لندن اور پیرس اسٹیشنوں سے اسے نشر کرنا بند کر دیا گیا[۲۶]۔ بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنے کے باوجود مسلمان خواتین نے اس باب کو بند نہیں ہونے دیا بلکہ انہوں نے اس کہانی میں نئے صفحات کا اضافہ کیا۔ فن قرأت میں ماہر عورتیں ماضی میں بھی تھیں اور اب بھی اگرچہ زیادہ منظر عام پر نہیں ہیں، تاہم بڑی

---

[۲۵] Internet Archive 2018. Available at: http://archive.org/details/English_Quran . (Accessed on 15 September 2022).

[۲۶] Scene Arabia, Her Voice wasn't Awrah: Meet Sheikha Munira Abdou, Egypt's First Radio Quran Reciter. Available at: https://m.scenearabia.com/Life/Meet-Sheikha-Munira-Abdou-Egypt-s-First-Radio-Quran-Reciter . (Accessed on 16 September 2022).

تعداد میں موجود ہیں۔ عصر حاضر میں قرآن کی معروف قاریات میں سے ایک خاتون دو قومی قرأت کے مقابلوں کی فاتح اور انڈونیشیا کی قرأت کی استاد ماریہ الفاہیں۔ دیگر مشہور قاریات میں سنگاپور کی عتیقہ سہیمی، مراکش کی ایمان ایزوتنی: جو دبئی میں ۲۰۱۶ء میں منعقدہ شیخہ فاطمہ بنت مبارک بین الاقوامی قرآنی مقابلے کی فاتح رہیں[۲۷]، مراکش کی فرح البکالی اور خولہ دارکاوئی، جنوبی افریقہ کی آمنہ ہنڈرکس، کیلیفورنیا کی حلیمہ نالو عفی، امریکی جینیفر گراؤٹ، وئام اهروش وغیرہ شامل ہیں[۲۸]۔ اگرچہ تاریخ میں خواتین قرآنی اسکالرس کی زیادہ تعداد ہمیں نہیں ملتی تاہم پوری اسلامی تاریخ میں ایسی کئی مسلمان خواتین ملتی ہیں جنھوں نے مطالعات قرآن کے میدان میں اہم کام کیا۔ ڈاکٹر اکرم ندوی نے حدیث کے میدان میں تحقیق کی اور تقریباً دس ہزار محدثات تلاش کیں اور ان کے بارے میں تینتالیس جلدوں میں سوانحی کتاب ''الوفاء باسماء النساء'' جو ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی، لکھی۔ اگر اسی طرح کی تحقیق قرآنیات کے میدان میں کی جائے تو اس شعبے کی مزید تاریخی خواتین کے احوال دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت مسلمان خواتین اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے آواز اٹھا رہی ہیں، تقریباً تمام اسلامی علوم کے مطالعہ اور تحریر میں حصہ لے کر اسلامی فکری تاریخ کی میراث کو آگے بڑھانے میں اہم رول انجام دے رہی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام میں تعلیم حاصل کرنا اور اس نور کو دنیا تک پہنچانا صرف مردوں کا ہی نہیں، بلکہ مرد اور عورت دونوں جنسوں کا حق اور فرض ہے۔ خاص طور پر قرآنیات کے میدان میں عورتوں کی خدمات اسلامی ادب اور فکر میں نسائی نقطہ نظر کو شامل کرنے کے سلسلے میں ایک بڑا اضافہ ہے۔ تاہم ان کی ترقی اور پیش رفت کی راہ میں اب بھی کچھ مسائل اور رکاوٹیں حائل ہیں جن پر قابو پانا باقی ہے۔

---

[۲۷] *Khaleej Times*, Moroccan contestant wins 'Most beautiful recitation'. Available at : http://www.khaleejtimes.com/article/moroccan-contestant-wins-most-beautiful-recitation?amp=1(Accessed on 16 September 2022).

[۲۸] For more female reciters check https://www.amaliah.com/post/64220/female-reciters-of-the-quran, (Accessed on 16 September 2022) visit also YouTube channel 'Female Quran Reciter' https://youtube.com/c/FemaleReciter and Qariah App created by Maryam Amir in 2022.

# مولانا دریابادی کی آپ بیتی
## بیسوی صدی کے ہندوستان کا معتبر ماخذ

**کلیم صفات اصلاحی**

رفیق دارالمصنّفین اعظم گڑھ

ہندوستان کی مشہور و معروف آپ بیتیوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی کو اس کے اسلوب، جامعیت، زبان، حسن ادا، واقعات اور معلومات کے لحاظ سے خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا زمانہ تسوید تو گزشتہ صدی کے نصف اول کا دوسرا عشرہ ہے لیکن اس میں حالات اور اپنے عہد کے واقعات اس طرح سے لکھے ہیں کہ پوری پون صدی کے اہم علمی ، تمدنی، تجارتی، سیاسی، عالمی واقعات کا خلاصہ آگیا ہے۔ گویا اس میں بیسویں صدی کا وہ متحرک ہندوستان موجود ہے جس کی تصویر کشی مولانا ماجد کے سحر نگار قلم سے کی گئی ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس کا مطالعہ اسی خصوصی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہد ماجدی کا پر آشوب اور ہنگامہ خیز ہندوستان عصر حاضر کے ہندوستان سے کس قدر مماثل یا مغایر ہے۔ مولانا کا تعلق یوں تو دریاباد سے ہے لیکن ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تھی اور مولانا لکھنوی تہذیب و ثقافت کے پروردہ تھے، اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ گذشتہ لکھنؤ اور اودھ کی تہذیب و ثقافت سے ان کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس زمانے کے ممتاز اہل علم و ادب اور معاصر سیاسی و ادبی شخصیات اور مجاہدین آزادی سے ان کے تعلقات تھے۔ ان حضرات کی سرگرمیوں کا منظر نامہ بھی اس میں یقیناً دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جو حال کے معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا ماجد نے غلام ہندوستان میں آنکھ کھولی اور آزادی کا سورج طلوع ہوتے دیکھا۔ غلامی و آزادی کی کشمکش میں مسلمانوں نے اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے ملک و وطن کے لیے کس قسم کی قربانی دی اور ان کے ذریعہ قوم و ملت کو جو عظیم الشان فائدہ پہنچا وہ کس نوعیت کا تھا۔ ہنگامی حالات میں نفع رسانی کے لیے آخر وہ کون سا ذریعہ انہوں نے اپنایا تھا کہ موجودہ ناگفتہ بہ حالات میں آج کا مسلمان اسے اپنا کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ آپ بیتی موجودہ مسلمانوں کے لیے مہمیز کا کام کر سکتی ہے۔ اس کا مطالعہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ کے اہم وثیقہ کے طور پر بھی کیا جانا چاہئے۔ اس لیے کہ اس میں ملک و وطن، دین و سیاست، تمدن و معاشرت کے وہ سچے اور آنکھوں دیکھے واقعات لکھے گئے ہیں جو آج تاریخ کا حصہ ہیں اور زندہ قومیں اپنے ماضی سے سیکھ کر

حال کو درست کرتی ہیں۔ یہ واقعات ایسے زمانہ کے ہیں کہ جو نئی جد وجہد اور نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے انقلاب کو آواز دے رہا ہے اور نئی کروٹ کے لیے بیتاب ہے۔ ایسے زمانہ میں صاحبان عقل وبصیرت کے لیے عبرت و موعظت اور تاریخ و تہذیب کے بہت سے پہلو اور مواقع ہیں جن سے واقف ہونا موجودہ نسل کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے آپ بیتی اور اس کے ابواب پر مختصر ا نگاہ ڈالنا ضروری ہے تاکہ اس کا ایک اجمالی خاکہ قارئین کے سامنے آجائے۔

**آپ بیتی کی مدت تسوید اور اس کے ابواب:** مولانا کے بیان کے مطابق اس خود گزشت کا آغاز جولائی ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ پھر چند ہی ورق کے بعد رک گئے۔ اس کے بعد جنوری ۵۶ء سے قلم پھر چل پڑا ۱۴ اگست ۵۸ء میں یہ سفر ختم ہو گیا۔ ۵۴ سے ۵۸ء اور پھر مسودہ کی ترمیم اور س پر آخری نظر ثانی کا کام ۶۷ء میں ہوا۔ یہ پوری مدت تقریباً چودہ سال پر مشتمل ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کے بیان کے مطابق اس کے لکھنے کی صحیح معنوں میں واقعی کل مدت محض پانچ مہینے کی رہی جب مولانا نے پچھترویں سال میں اپنی عمر کا قدم رکھ لیا تھا[1]۔ مولانا نے دیباچہ کے آخر میں یہ خبر دے دی تھی کہ اس کی طباعت کی نوبت ان کی وفات کے بعد ہی آئے گی۔ چنانچہ ان کی یہ بات صحیح ہوئی۔

مولانا نے پیدائش سے لے کر وفات سے تقریباً دس برس قبل تک کے حالات اکیاون ابواب میں تحریر کیے ہیں اور مرکزی ابواب مثلاً ماحول واجداد، پیدائش، خانگی تعلیم وتربیت، اسکولی زندگی، کالجی زندگی، ازدواجی زندگی، مضمون نگاری وصحافت، الحاد وارتداد، اسلام کی طرف بازگشت، سیاسی زندگی، بیعت وارادت، تصنیف وتالیف، معاشی ومالی زندگی، شاعری یا تک بندی، سفر، صحت، اولاد، مخالفین ومعاندین وغیرہ عناوین سے معنون کیا ہے۔ اس سے مولانا کے سوانح نگاروں کے لیے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ مولانا کی زندگی کے جس پہلو کو پڑھنا یا جس پر وہ لکھنا چاہیں بہ آسانی ان ابواب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ مولانا غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس طریقہ کی بنیاد رکھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ان (مولانا ماجد) کی زندگی کا مرقع ہے۔ اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کا سفر طے کیا۔ کسی زمانہ بلکہ قریبی زمانہ میں ان اہل قلم اور مؤرخوں کو بھی اس سے بڑی مدد ملے گی جو اس دور کے تمدن ومعاشرت پر کچھ لکھنا چاہیں

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، جے کے آفسیٹ پریس دہلی، ناشر مکتبہ فردوس مکارم نگر (برولیا) لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص ۱۳

گے[۲]۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس آپ بیتی میں ہندوستان کے علمی، تمدنی اور معاشرتی حالات کی جو تفصیل موجود ہے وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔اس میں کسی طرح کی غلط بیانی یا کذب وافترا کا کوئی دخل نہیں۔ان واقعات سے اخذ نتائج میں عدم صحت واستدلال پر بحث تو کی جاسکتی ہے لیکن اس کے موثق اور قابل اعتماد تاریخ ہونے پر تو کہیں سے کسی قسم کے شک وریب کا الزام نہیں لگ سکتا۔مثال کے طور پر مولانا نے اپنے عہد کے طرز معاشرت اور تعلیم و تعلم اور سیاست وغیرہ کا جو حال لکھا ہے وہ تو یقیناً غلط نہیں لکھا ہے۔اس آپ بیتی میں ان پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں بیسویں صدی کے اس ہندوستان کی جھلک دکھائی دے جس سے حال کے ہندوستان کے ملی، علمی، سیاسی، ثقافتی مسائل ومعاملات میں کچھ مدد لی جاسکے۔

**اشیاء خورد ونوش کی ارزانی و گرانی:** مولانا کے زمانے کا ہندوستان کیسا تھا اور اس زمانہ کے خط وخال کیا تھے۔اس کا ذکر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر معاشرہ پر بڑی گہری تھی۔ہر چیز کو وہ بڑی باریک بینی سے دیکھتے تھے۔ان کا تجزیہ اسی لیے بہت اہم ہوتا تھا۔آج ہندوستان کے اہم مسائل میں گرانی اور روپیہ میں گراوٹ کا مسئلہ عام لوگوں کے درمیان بہت زور وشور سے زیر بحث ہے اور یہ الیکشن کے ہار جیت کا مسئلہ بھی بن گیا ہے۔مولانا کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ پوری شدت سے موجود تھا۔اٹھارہویں صدی کے شروع اور انیسویں صدی میں جب ہندوستان ابھی آزاد نہیں ہوا تھا اس وقت چیزیں کس قدر سستی اور ارزاں تھیں اور جب ملک آزاد ہوا اور ہندوستانیوں کی اپنی حکومت قائم ہوئی تو مہنگائی آسمان چھونے لگی۔مولانا کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> اٹھارہویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کے شروع میں قیمتیں نہایت ارزاں تھیں۔رفتہ رفتہ قیمتیں بڑھنا اور چڑھنا شروع ہوئیں۔یہاں تک کہ دنیا کی دوسری جنگ عظیم جب پانچ سال بعد ۱۹۴۶ء میں ختم ہوئی تو چیزوں کے نرخ دوگنے، ڈھائی گنے، بلکہ تگنے ہو گئے تھے۔اگست ۱۹۴۷ میں جب انگریزی حکومت ہندوستان سے اٹھی اور ملک کی حکمرانی خود ملک والوں کے قبضہ میں آئی، اس کے بعد سے تو گرانی کی جیسے کوئی حد ونہایت ہی نہیں رہ گئی۔چنانچہ اب ۶۷ء میں پرانی قیمتیں آٹھ گنی نہیں بلکہ دس گنی ہو گئی ہیں اور اب بھی ان کے رکنے اور ٹھہرنے کے آثار

---

[۲] ماخذ سابق ص ۱۱

نہیں بلکہ آثار مزید گرانی اور گرانی در گرانی ہی کے ہیں اور روپیہ کی قیمت قدرتاً اسی تناسب سے اترتی گئی۔[۳]

مولانا نے اپنے زمانہ کی مہنگائی اور اس کے بڑھنے کا تذکرہ جس طور سے کیا ہے آج بھی منگائی کے بڑھنے کی رفتار اس سے کم نہیں اور روپیے میں گراوٹ جس انداز سے آج آئی ہے اور کہا جارہا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اب تک روپے میں اس قدر گراوٹ ریکارڈ نہیں کی گئی تھی۔اس سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے مہنگائی اور نرخ کے معاملہ میں ہندوستان آزادی سے پہلے جس مقام پر کھڑا تھا آزادی کے بعد بھی وہیں ہے اور اس میں ابھی تک سدھار نہیں آسکا ہے۔عوام کی اکثریت کمر توڑ مہنگائی سے دوچار ہے۔اب تو امیر وغریب میں تناسب کا فاصلہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ مستقبل قریب میں اس کھائی کے کم ہونے کے بجائے مزید بڑھنے کا ہی امکان ہے۔

**زمینداری و تعلقہ داری:** ۱۹۴۷ء تک زمینداری و تعلقہ داری کا رواج تھا۔زیادہ بڑے زمیندار تعلقہ دار اور چھوٹے زمیندار زمیندار کہلاتے تھے۔مولانا کے زمانہ میں معمولی زمیندار بھی خوش حال ہوتے تھے اور تعلقہ دار طبقے کا شمار توراجہ،مہاراجہ اور نواب میں ہوتا تھا اور بہت صاحب دولت وثروت ہوتے تھے۔مولانا کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں جب نظام حکومت بدلا تو یہ ادارہ(یعنی تعلقہ داری و زمینداری کا نظم)سرکاری حکم سے توڑ دیا گیا اور یہ تمام طبقات مفلوک الحال ہوگئے اور جو کچھ ان کو معاوضہ ملا ان کی پچھلی آمدنیوں سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا تھا۔[۴]

اس سے معاشرہ کے خاص طبقہ کا نقصان ضرور ہوا اور یقیناً یہ بڑا نقصان تھا لیکن اس کے پیچھے عام اور غلامانہ زندگی بسر کرنے والے مزدوروں کو جو فائدہ حاصل ہوا اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔دولت اور جائیداد چند لوگوں میں مرتکز ہونے کے بجائے زیادہ لوگوں تک پہنچی۔زمینداروں کے مزدوروں پر مظالم کا سلسلہ رکا۔ہر شخص کو اس کی محنت کا جو حق ملنا چاہیے وہ اس کو ملنے لگا۔غلامی کی شکلیں ختم ہوئیں اور آزادانہ طور پر کام کرنے سے مانگنے کے اجالے والی کیفیت بھی بہت حد تک کم ہوئی۔انسانی جوہر عزت نفس جو اس نظام کے پیروں کے نیچے روندی جارہی تھی کو فروغ حاصل ہوا۔دولت پر اجارہ

---

[۳] ماخذ سابق ص ۱۵-۱۶

[۴] ماخذ سابق ص ۱۶

داری کے سبب تعلیم و تعلم کا جو فیض خواص میں محدود تھا وہ عام ہوا۔

**سفر کے لیے سواریاں:** آج ہندوستان میں سواریوں کی جو ریل پیل نظر آتی ہے اور ہر گھر بلکہ بچہ بچہ اس کی بہتات سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان میں سواریوں کے لیے کیا چیزیں استعمال ہوتی تھیں اس کا ذکر اس میں تفصیل سے ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان میں سواریوں کے لیے ریل کے علاوہ بگھی (فٹن، پالکی گاڑی، لینڈو، ٹمٹم) اکے، بیل گاڑی اور اونٹ گاڑی تھی۔ سواری کے جانور گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ تھے اور زنانی سواریاں ڈولی، پالکی، فینس اور میانہ کی تھیں جنہیں کہار اٹھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گھٹتی گئیں۔ مولانا کی اس آپ بیتی سے ہندوستان میں جدید سواریوں کی آمد کا حال معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سائیکلیں آئیں، پھر تانگے اور ان کے بعد رکشے چالو ہوئے۔ موٹر، موٹر سائیکلیں، اسکوٹر کا دور آیا۔ جیپیں اور بسیں بھی عام ہو گئیں اور ہوائی جہاز بھی ہر وضع اور سائز کے فضا میں اڑنے لگے۔ اس انقلاب کا اثر تمدن و معاشرت کے ہر شعبہ پر پڑا[۵]۔ یعنی ٹرانسپورٹ کی سہولت کے سبب سب سے زیادہ اثر وسائل تمدن و معاشرت پر پڑا جس سے اس وقت عام ہندوستانی بھی مستفید ہو رہا ہے۔

**ارتداد کی ابتدا و ارتقا:** برادران وطن کی طرف سے جہاں مسلمانوں کی ماب لنچنگ اور ان کی ہر سطح پر بے آبروئی و تذلیل وغیرہ کے متعلق بہت سی خبریں آتی ہیں اور ان کے دلوں کو چھلنی کر دیتی ہیں وہاں خود کلمہ گویوں کے اسلام سے پھرنے یا مرتد ہونے کی خبروں سے ان کا دل زخم سے مزید ہرا ہو جاتا ہے۔ آئے دن مسلم لڑکوں اور لڑکیوں اور اب تو خاندانوں کے مرتد ہونے کی خبریں اخبارات اور سوشل میڈیا کے ذریعہ مشتہر ہوتی رہتی ہیں۔ اگر اس وقت سوشل میڈیا کی مانیں تو مسلمانوں خاص طور سے مسلم لڑکیوں میں ارتداد کا ایک طوفان آیا ہوا ہے۔ جو اگرچہ اتنا ہمہ گیر نہیں ہے جتنا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے لیکن اسلام سے اگر ایک مؤمن پھر گیا تو اس کا اثر پورے اسلام اور مسلم معاشرہ پر پڑتا ہے۔ ہمارے نزیک یہ مسئلہ اس لیے بھی بہت بڑا ہے۔ بظاہر اس کی کارگر تدبیریں بھی مسلمانوں کی جانب سے نہیں ہو پا رہی ہیں اور وہ اس مسئلہ میں بالکل لاچار اور مجبور محض نظر آ رہے ہیں۔

مولانا کے بچپن میں تو کسی مسلمان کے ارتداد کا تصور ہی نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان

---

[۵] ماخذ سابق

ہی کے عنفوان شباب میں اس مسئلہ کی ابتدا ہوئی اور مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی آریہ سماجیوں کی شدھی تحریک کو اسی زمانہ ہی میں بال و پر آنا شروع ہو گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مغربی یوپی میں اچھا خاصا پیر جمالیا تھا۔ مولانا شبلی نے تو باقاعدہ اس کا مقابلہ کیا اور مدت العمر اس کے ازالہ کی تدبیریں کرتے اور اس کے لیے فکر مند رہے۔ مولانا دریابادی نے ارتداد کے سلسلہ میں لکھا ہے:

میرے بچپن میں ہندو وقتاً فوقتاً مسلمان ہوتے رہتے۔ کسی مسلمان کا مرتد ہو کر ہندو دھرم قبول کر لینا ناقابل تصور تھا۔ رفتہ رفتہ آریہ سماجیوں نے کسی کسی کو مرتد کرنا شروع کیا اور ایک زمانہ میں تو شدھی کی تحریک بڑے پیمانہ پر چل نکلی۔ اس طرح کسی کلمہ گو عورت یا لڑکی کا کسی ہندو یا سکھ کے ''عقد'' میں چلا جانا ناقابل تصور تھا۔ راج کی تبدیلی کے بعد یہ خواب بھی ایک حقیقت بن گیا۔[۶]

بیسویں صدی کے آغاز میں آریہ سماج نے ایک سادہ لوح مسلمان کو مرتد کر لیا تھا تو پورے ملک میں سنسنی پھیل گئی اور وہ پھر تائب ہو کر اسلام پر آ گیا تھا۔ مولانا اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

بیسویں صدی عیسوی کا آغاز تھا کہ بڑا زور آریہ سماجی پروپیگنڈے کا بندھا۔ خصوصاً پنجاب اور ہمارے صوبہ میں۔ اور اب کیا بندھا۔ یہ کہیے کہ ۲۰، ۲۵ سال قبل کا بندھتا چلا آرہا تھا۔ مسلمان اس سے اور قبل مقابلہ و مناظرہ مسیحی پادریوں کا کامیابی کے ساتھ کر چکے تھے لیکن بد زبانی و دلآزاری اور بازاریت میں نمبر آریہ مناظرین کا پادریوں سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ منہ میں جو کچھ بھی آتا بس بے دھڑک یہ بک اٹھتے۔ غالباً ۱۹۰۲ء تھا کہ آریہ سماجیوں نے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے کسی سادہ مزاج مسلمان[۷] گریجویٹ کو پھانس کر آریہ بنالیا تھا۔ خود اس سے اس کے وجوہ ارتداد پر ایک بڑی بد لگام کتاب ترک اسلام لکھا ڈالی ملک بھر کی فضا میں جیسے سنسنی پھیل گئی اور جس مسلمان نے جہاں سنا، بس سناٹے میں آ گیا۔[۸]

مولانا کے زمانہ میں جو تحریک عہد طفولیت میں تھی اب اس نے جوان ہو کر ''گھر واپسی'' کی شکل اختیار کر لی ہے اور حد تو یہ ہو گئی ہے کہ بعض فکری لحاظ سے دیوالیہ پن کے شکار مسلمان لڑکے اور لڑکیاں

---

[۶] ماخذ سابق ص ۱۷

[۷] یہ گوجرانوالہ کا ایک مسلمان تھا جس کا نام عبد الغفور تھا۔ ۱۹۰۳ء میں مرتد ہونے کے بعد اس کا نام دھرم پال ہوا۔

[۸] ماخذ سابق ص ۲۰۵

ڈنکے کی چوٹ پر اسلام کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار کر پھینک رہی ہیں اور خود کو اسلام کے بجائے غیر مذہب میں محفوظ سمجھ رہی ہیں۔ایسے ناعاقبت اندیشوں کو اکثریت اور حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے،اس لیے یہ پوداابھر اہو رہا ہے اور جلد ہی ایسے تناور درخت کی شکل بھی اختیار کرلے گا جس کی شاخیں اسلامی معاشرہ میں پھیلتی ہی جائیں گی۔اور ایک وقت آئے گا جب بہ حیثیت قوم مسلمان اپنی شناخت بھی کھودیں گے۔یاللعجب۔

اس بند کو روکنے کے لیے پہلے جو کوششیں کی گئیں یا اس وقت کی جارہی ہیں یا تو ان کا قبلہ درست نہیں ہے یا پھر اس کے ازالہ کے لیے جس ایثار و قربانی اور توجہ کی ضرورت ہے وہ پوری نہیں ہو پارہی ہے۔ہمارے خیال میں اس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ اس بڑے اور اہم مسئلہ کی جانب سے عام بے توجہی،قرآن سے دوری،گھروں میں بے دینی کا ماحول،زندگی میں عقیدۂ آخرت سے غفلت،خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس اور اسلامی عقائد و اصولیات پر یقین کی کمی اور سب سے بڑھ کر اقرار باللسان،تصدیق بالقلب اور عمل بالجوارح کا صحیح معنوں میں فقدان ہے۔جب تک عقیدہ و عمل کے ان اصولوں کو زندگی کا لازمہ اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی،ایثار اور ثابت قدمی کو وطیرہ نہیں بنایا جائے گا صورت حال میں تبدیلی ناممکن ہے۔

**پردہ کا رواج اور تعلیم نسواں کی صورت حال:** ہندوستان وہ ملک ہے جہاں پردہ اور تعلیم نسواں کے معاملہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں دونوں بڑی قومیں نظریاتی لحاظ سے تقریباً ایک ہی نکتہ پر قائم تھیں لیکن اس کے بعد زمانہ نے ترقی کی وہ چھلانگ لگائی کہ بے پردگی تک چلا گیا اور دونوں قوموں میں ایسی روشن خیالی پیدا ہوئی کہ اس نے پردہ کی ضروت اور معاشرہ میں اس کی اہمیت کو پہلے خاص اور بعد میں عام لوگوں میں اس قدر کم کردیا کہ آگے بڑھنے،زمانہ کے دوش بدوش چلنے اور اس سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کے چکر میں بے حجابی کو بھی قبول کرلیا۔بیسویں صدی کے ہندوستان میں ہندو اور مسلم گھرانوں میں پردہ کا بہت اہتمام تھا۔عورتیں برائے نام تعلیم حاصل کرتی تھیں جو فی الحقیقت درست نہیں تھا۔شرم وحیا جس سطح پر تھی آج کے بے پردہ ماحول میں اس کا تصور بھی محال ہے لیکن بعد میں اس میں تبدیلی آئی۔پردہ اور تعلیم نسواں کے معاملہ میں مولانا نے اپنے آس پاس کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے:

> پردے کا رواج ہندو گھرانوں میں بھی شرافت واعزاز کی علامت سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے اونچے خاندانوں میں تو پردہ شدت ہی سے نہیں افراط کی حد تک رائج تھا اور تعلیم مسلمان عورتوں

اور لڑکیوں کی برائے نام ہی تھی اور شرم وحیا حدود شریعت و عقل سے بھی تجاوز کیے ہوئے تھی۔ چنانچہ کوئی شریف بیوی اپنے شوہر کا نام کسی حال میں اپنی زبان پر نہیں لاسکتی تھی۔ اور شوہر کے نام سے بھی آگے سسرال، سسرالی عزیزوں کے نام شوہر کے نام سے ملتے جلتے نام تک سب اس کے لیے حرام تھے۔ دیکھتے دیکھتے صورت حال بالکل بدل کر رہ گئی۔ بڑی بڑی شریف بیویاں یہی نہیں کہ بے تکلف باہر بے پردہ گھومنے پھرنے لگیں بلکہ بے پردگی کے ساتھ بے حجابی بھی عام ہوتی گئی بلکہ نوبت بے ستری کی بھی پہنچ گئی۔ ۱۹۷۶ء تک مسلمانوں کی زنانی آبادی میں بی،اے، ام اے، ال ال بی، پی ایچ، ڈی وغیرہ ہر طرف نظر آنے لگیں ہیں اور ملازمت اور کاروبار کا کوئی شعبہ، کوئی پیشہ، کوئی عہدہ ان سے خالی نہیں۔[9]

اس صورت حال کے پیدا ہونے میں ہر چیز میں مغرب کی اطاعت واقتدا کا بھی بڑا دخل تھا۔ ترقی کے نام پر اس بے لگام آزادی کے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ آج کسی بھی ہندوستانی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

**مولانا کے بچپن کا مخصوص مسلم معاشرہ اور اس میں تبدیلی:** مسلمان جہاں بھی رہتے بستے ہیں، اپنے مخصوص تمدن کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی اپنی تہذیب ان کو جان سے عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان کا تہذیبی ڈھانچہ ان کے مذہبی اصولوں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ مخصوص معاشرتی طرز رہائش مولانا ماجد کے بچپن تک کسی نہ کسی حد تک باقی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں خوش حال گھرانوں میں ہاتھ سے کام کرنا عیب میں داخل تھا۔ نوکروں چاکروں کا رواج تھا۔ زنان خانوں میں مامائیں، اصیلیں اور درمیانی گھروں میں لونڈیاں، باندیاں تھیں۔ شریعت کے علاوہ اب قانون وقت کے لحاظ سے بھی لونڈیوں کا کوئی جواز نہ تھا لیکن عملاً یہ سب عموماً زر خرید کے حکم میں تھے۔ عام انسانی حقوق تک سے محروم گھر یا گھر کے پلے ہوئے جانور ہیں۔ صرف کوئی کوئی آقا شفیق اور رحم دل مل جاتے تھے۔ لیکن ان ہی کے زمانہ میں اس میں زبردست انقلاب آیا۔ انگریزیت اور مغربی طریق اور نظام تعلیم کے اثر سے صورت حال بالکل بدل گئی اور اختصاص بھی باقی نہ رہا۔ مولانا اپنے بچپن کے حالات لکھتے ہیں:

میرے بچپن تک مسلمانوں کا ایک مخصوص معاشرہ تھا۔ خصوصی آداب واطوار تھے۔ خاص قسم کا لباس، خاص قسم کے بال، خاص قسم کے کھانے پینے وغیرہا۔ تغیر وانقلاب کی آندھی نے یہ سارا شیرازہ منتشر کر دیا۔ پہلے تو انگریزیت کا دور دورہ رہا۔ وضع و قطع، مکان ولباس، کھانا پینا، سب

---

[9] ماخذ سابق ص ۱۸-۱۷

مغربی طریق کا ہوتا چلا گیا اور پھر اب ہندو تہذیب و معاشرت کا سیلاب آیا ہے جو نظام تعلیم ونصاب تعلیم کی مدد سے ساری ہی انفرادیت اسلامی کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ احساس کمتری کے ساتھ ساتھ علمی، تہذیب مرعوبیت سے لے کر اعتقادی اور دینی ارتداد کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔"[۱۰]

آزادی کے بعد ہی سے اس مخصوص مسلم معاشرہ کے زوال کی ابتدا ہو چکی تھی اور اب تو اس زوال نے اس قدر ترقی کر لی اور چند مخصوص اور وضع قطع کو چھوڑ کر باہم غیر قوموں سے اس طرح شیر وشکر ہوتے جا رہے ہیں کہ شناخت ہی مشکل ہوتی جا رہی ہے اور کہا تو یہاں تک جا رہا ہے کہ اس وقت جو کچھ تھوڑی بہت شناخت باقی ہے وہ دینی مدارس سے باقی ہے اور مدارس کے ساتھ اس وقت جو سلوک ہو رہا ہے اس وہ بھی جاں بلب ہوتے جا رہے ہیں۔ جب یہ تشخص نہیں رہے گا تو نسل مسلمانی کو مرتد و مرعوب ہونے سے بہ ظاہر کیا چیز بچائے گی؟۔

**تقسیم کے وقت کیا ہوا؟:** ہندوستانی اقوام نے مل جل کر ہندوستان کو برطانوی اقتدار سے آزاد کرایا۔ یہ کامیابی ہندوستانیوں کے متفقہ محاذ اور انگریزوں کے خلاف متحدہ کارروائیوں کی بے نظیر اور روشن ترین تاریخ کا حصہ ہے لیکن حصول آزادی کے بعد شومی قسمت وطن عزیز کے حصے بخرے مولانا کی نگاہوں کے سامنے ہوئے۔ اس عظیم الشان واقعہ کا ذکر بھی مولانا نے اپنے جامع اسلوب میں کیا ہے۔ مولانا اس پر اپنی نگاہ برابر رکھے ہوئے تھے۔ اس اندوہناک واقعہ اور خونچکاں داستان کو مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

اگست ۱۹۴۷ء تک سارا ہندوستان انگریزوں کے تابع تھا۔ پاکستان بنا تو پنجاب اور بنگال دو دو ٹکڑے ہو کر پاکستان میں شامل ہو گئے اور سندھ وبلوچستان اور صوبہ سرحد وغیرہ تو پورے ہی پاکستان کے جزو بن گئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی تقریباً دس کروڑ سے گھٹ کر پانچ کروڑ ساڑھے چار لاکھ رہ گئی۔۔۔۔ خاندان کے خاندان مسلمانوں کے خصوصاً یوپی کے مسلمانوں کے، اجڑ گئے، مٹ گئے اور کٹ گئے۔ ایک بھائی یہاں، دوسرا وہاں۔ باپ ادھر تو بیٹا ادھر۔ وہ افراتفری پڑی اور اکھاڑ پچھاڑ ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ اور لکھ لکھا مسلمانوں کی جو جانیں گئیں، عزتیں مٹیں، عصمتیں لٹیں اور کروڑوں کا مالی نقصان ہوا ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ ہندوستان کی حکومت سرکاری کاغذوں پر "نامذہبی" قرار پائی لیکن عملاً گاندھی جی اور جواہر لال نہرو وغیرہ کی

---

[۱۰] ماخذ سابق ص ۱۹

تتو تھمبو کے باوجود بھی بڑی حد تک ہندو حکومت بن گئی۔ مسلمان ہراس زدہ اور حواس باختہ احساس خودداری کھو بیٹھے اور ہر معرکہ میں ''اکثریت'' اور حکام اور پولیس کے ہاتھوں پٹنے اور مار کھانے لگے۔[11]

تقسیم کے وقت یوں تو یہاں کی حکومت سیکولر ''نامذہبی'' قرار پائی۔ یعنی مذہب، تہذیب، پیدائش اور قوم کے لحاظ سے کسی کے ساتھ تفریق یا بھید بھاؤ نہ رکھنے کا اعتراف کیا گیا تھا لیکن مولانا ماجد کی آنکھوں نے وہ منظر پہلے ہی دیکھ لیا تھا جس میں آج کا مسلمان زندگی گذار رہا ہے اور انھوں اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ نامذہبی نہیں بلکہ ہندو حکومت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس جملہ سے مولانا ماجد کی دور اندیشی، مستقبل شناسی اور حالات پر پیش بیں ادراک و بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آج منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۲۰ یا ۲۲ فیصد یعنی بیس سے پچیس کروڑ ہے۔ تعداد کے لحاظ سے اس میں کئی مسلم ملک سما سکتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد کے باوجود تقسیم کے وقت مسلمان جن مسائل و مشکلات سے گھرے ہوئے تھے ہونا یہ چاہئے تھا کہ محروم قوموں کی طرح وہ باہم متحد ہو کر علم و عمل اور تمدن و سیاست میں ایک طاقت ہوتے اور برادران وطن میں اپنے اخلاقی اوصاف اور باہمی ملی و سماجی مساوات کے سبب ان کی ایک شناخت قائم ہوتی لیکن مسلکی اختلافات اور آپسی نااتفاقیوں کی وجہ سے آج بھی ملت تقریباً وہی بلکہ اس سے بھی زیادہ بری حالت میں چلی گئی ہے جس کا نقشہ مولانا نے کھینچا ہے۔ مولانا نے "نامذہبی" حکومت کے قیام کو ''بڑی حد تک ہندو حکومت'' سے تعبیر کیا ہے وہی حکومت آج غیر اعلانیہ ہندو راشٹر کی طرف گامزن ہے۔ کاش اسی وقت سے اس مسئلہ کی جانب توجہ دی گئی ہوتی اور برادران وطن کو ساتھ لے کر اس کے حل کی کوشش کی گئی ہوتی تو بے وزنی و بے وقعتی کی یہ کیفیت شاید نہ ہوتی۔ اردو، خلافت، مملکت آصفیہ وغیرہ کا جو حشر ۱۹۴۷ء میں ہوا اس کا تذکرہ بالاجمال اس طرح کیا کہ پوری صورت حال سامنے رکھ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

اردو کا زور ۴۷ء تک رہا۔ ''آزادی'' ملتے ہی ہندی والوں کا تعصب اردو پر ٹوٹ پڑا۔ کچہریوں، دفتروں، سڑکوں کی تختیوں سے اردو حروف چھیل چھیل کر، کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے، اب ۶۷ء ہے اور خیر کچھ کچھ پیر ٹیکنے بھر کی اردو والوں کو ملنے لگی ہے۔ عدم محض سے اتنا غنیمت ہے۔۔۔۔ ۲۲ء تک خلیفۃ المسلمین کے نام کا بھرم دلوں میں قائم تھا اور ہندوستان کی خلافت

---

[11] ماخذ سابق ص ۱۸

کمیٹی نے خلافت اسلامیہ کا جوش از سر نو دلوں میں تازہ کر دیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفی کمال نے باقاعدہ یہ منصب عظیم ہی مٹا دیا۔ محمد علی یہاں بہت چیخے ، چلائے، تڑپے، نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۱۹۴۷ء تک مملکت آصفیہ ایک ریاست نہیں پوری سلطنت تھی۔ اپنا سکہ، اپنا ڈاک خانہ، اپنی ریل وغیر ہا۔ ۴۸ء میں اس کا بھی قلع قمع ہو کر رہا اور حیدر آباد جو سارے مسلمانان ہند کا ملجا وماویٰ تھا، ''آندھرا پردیس'' بن کر مملکت ہند کا ایک جز حقیر بن گیا۔[12]

مولانا نے اس وقت کے ہندوستان میں مسلم مخالف سر گرمیوں کا جو حال لکھا ہے اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی میں ان سر گرمیوں کے رول کو تسلیم نہ کرنا شتر مرغ کے ریت میں سر ڈالنے کے مترادف ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلمان ان حالات سے سیکھتے اور آنے والے طوفان کا اندازہ کرتے لیکن نہ ماضی میں اس کے تدارک کی اطمئنان بخش کوشش ہوئی اور نہ حال ماضی سے بہتر نظر آرہا ہے۔

**''بسم اللہ'' کی دلچسپ رسم:** مسلمانوں کے خوش حال اور اہل علم گھرانوں میں اس زمانہ میں رسم بسم اللہ کا رواج اور بڑا اہتمام تھا جو اب عام طور سے مفقود ہے۔ یہ رسم مسلمانوں میں کیسے اور کیوں کر قائم ہوئی اور اس کا عام لوگوں میں افادیت کا کیا پہلو ہے۔ یہ الگ بحث ہے۔ البتہ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خواص میں اس رسم نے باقاعدہ رواج کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مولانا کی بسم اللہ اسی رواج کے مطابق کرائی گئی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

بسم اللہ اب کیا بتایا جائے کہ یہ متبرک رسم اس وقت تھی کیا۔ انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے بھی ربع اول تک دستور ہر پڑھے لکھے گھرانے میں تھا کہ بچہ ادھر پانچ سال کا ہوا کہ ادھر اسے عام پڑھائی لکھائی شروع کرانے سے قبل ایک چھوٹے سے مجمع میں اسے بٹھا اور قواعد بغدادی نامے ایک پرانی دھرانی کتاب اس کے ہاتھ میں دے۔ لفظ بسم اللہ پر اس کی ننھی سی انگلی رکھا۔ کسی متبرک شخص کی زبان سے پوری بسم اللہ الرحمن الرحیم اس سے دہروادی جاتی تھی۔ مولوی صاحب ایک ایک ٹکڑا الگ الگ کہہ کر کہتے جاتے اور بچہ اسے دہراتا جاتا اور تبرکاً ایک آدھ دعا اور بھی پڑھادی جاتی۔ بسم اللہ کرانے والے کی خدمت میں حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا۔ حاضرین محفل کو شیرینی تقسیم کر دی جاتی اور سب لوگ والدین کو مبارک باد دیتے اور

---

[12] ماخذ سابق ص ۲۰

بغیر بسم اللہ اس تقریب کے تعلیم شروع ہی نہ ہوسکتی۔[۱۳]

اس کا مقصد ظاہر ہے حصول علم کے لیے لوگوں میں ایک اہتمام اور تعلیم کے لیے بچہ کے اندر شروع سے بیداری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اب نہ مسلمانوں میں وہ اہتمام رہا اور نہ ہی بچوں کے اندر بیداری کا معاملہ۔ لیکن یہ رسم نہ سہی مسلمانوں میں گذشتہ ۲۵، ۳۰ برسوں میں تعلیم کی جانب سے جو اعراض و عدم التفات پہلے تھا اب اس میں کمی آئی ہے۔

**ہندوؤں کی تہذیب:** ہندوؤں کا اس زمانہ میں طرز تہذیب و معاشرت کیسا تھا آپ بیتی میں متعدد جگہوں سے اس کے شواہد ملتے ہیں۔ مولانا کی تعلیم شروع میں ایسے اسکولوں میں ہوئی جہاں اساتذہ اور طلبہ زیادہ تر ہندو تھے۔ مولانا کو پہلی بار ہندو تہذیب و معاشرت سے وہیں سابقہ پیش آیا۔ مولانا اس ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں جس سے اس زمانہ میں ہندوؤں کے طرز معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ہندو تہذیب و معاشرت سے واقفیت کا پہلا موقع ملا۔ اس کا سلام دونوں ہاتھ جوڑ کر کرنا، کھانے پینے میں مسلمانوں سے تو خیر ہوتا ہی آپس میں بھی چھوت چھات برتنا، پنڈتوں کی تعظیم حد آخر تک کرنا، ان کے پیر چھونا، اس قسم کی باتیں پہلی بار علم میں آئیں۔[۱۴]

اسکولوں میں طلبہ کو سزائیں کس طرح دی جاتی تھیں۔ طلبہ کس انداز سے ہندو اکثریت والے اسکولوں میں رہتے تھے۔ کون کون سے کھیل ہوتے تھے اس کا ذکر بھی ملتا ہے:

> اسکول میں لڑکوں کو پٹتے ہوئے خوب دیکھا۔ بہ طور سزا کھڑے رہتے اور بنچ پر کھڑے رہتے۔ مرغا بنتے ہوئے دیکھا۔ لڑکوں میں گنوار پن عام طور سے تھا۔ شہری تکلفات سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور اسٹرائک، ہڑتال، آزادی، حقوق وغیرہ کا نام بھی کسی نے اس وقت تک نہیں سنا تھا۔ اسکول میں قدم رکھ کر جو چیز سب سے زیادہ نئی اور عجیب وہاں دیکھنے میں آئی وہ وہاں کی زندگی میں فحش کی آمیزش تھی۔ فحش کلامی بھی اور فحش کاری بھی۔ لڑکے آپس میں وہ فحش گوئی کرتے اور بے تکلف اور بے جھجھک وہ گالیاں زبان پر لاتے کہ گھر میں خیر انہیں سنتا تو کیا کبھی خیال میں بھی وہ نہ آئیں اور ادھر ماسٹر کی نظر بچی کہ ادھر کلاس میں ننگا پن شروع ہوگیا، زبان سے گزر کر عملی بھی۔ تفصیل کاغذ کے صفحے پر کیسے سب لائی جائے۔۔۔۔ یہ حال جب ۱۹۰۱ء

---

[۱۳] ماخذ سابق ص ۶۰-۶۱

[۱۴] ماخذ سابق ص ۹۳

میں تھا تو ۱۹۶۷ء کی ترقیوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔۔۔رواج کرکٹ کا زیادہ تھا لیکن فٹ بال بھی ہو جاتا اور کبھی دوڑ میں رسے کی کھنچائی بھی۔[۱۵]

اس اقتباس سے اس زمانہ میں ہندوؤں کی مخصوص تہذیب کے ساتھ ساتھ ان کے اسکولوں میں طلبہ کو تعلیم سے رشتہ قائم کرنے کے لیے سزا دینے کے رواج اور ان کی شکلوں کا علم ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ سزاؤں کے نفاذ میں کس قدر چوکس اور چوکنا رہتے تھے۔اس کا مقصد طلبہ کی تربیت اور ذہنی وفکری اصلاح تھا لیکن اب تو بچوں کی بدنی وجسمانی سزا پر پابندی ہے۔ایک خاص درجہ تک فیل نہ کرنے کی ممانعت بھی ہے۔ظاہر ہے دونوں قسم کے کرداروں اور رویوں میں افراط و تفریط کے جو نتائج ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔

**اس وقت سرکار سے وفاداری مسلمانوں کی عام پالیسی تھی:** ۱۸۵۷ء کی خونچکاں تحریک آزادی سے سب سے زیادہ مسلمان متاثر ہوئے تھے۔ برطانوی حکومت نے عام وخاص ہر طبقہ پر ظلم وستم کر کے ان کے حوصلہ وہمت کی کمر توڑ دی تھی۔اسی لیے مسلمانوں نے وقت وحالات کے تقاضہ سے مجبور ہو کر حکومت وقت سے وفاداری کی عام روش اپنا رکھی تھی۔مولانا نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو مسلمان اپنے وجود و تشخص کی بقا کے لیے اسی عام سیاسی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔جیسا کہ مولانا لکھتے ہیں:

جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلم پالیسی سرکار انگریزی کی تایید و وفاداری کی پائی۔ علی گڑھ تو خیر اس کے لیے مشہور ہی تھا۔ باقی دیوبند، ندوہ، فرنگی محل، بریلی، بدایوں کیا علما و مشائخ اور کیا قومی لیڈر اور اخبار سب اسی خیال وعقیدے کے تھے کہ سرکار کی وفاداری کا دم بھر جایئے مفاد ملی کا عین تقاضا یہی ہے۔اس شاہراہ سے الگ چلتے تھے مگر خال خال اور وہ انے گنے افراد۔ قوم کی لعن طعن کا ہدف بنے ہوئے۔۔۔ سرکار سے وفاداری کوئی عیب وشرم کی نہیں ہنر وفخر کی تھی۔[۱۶]

اس دور میں مسلمانوں اور اداروں کا جو حال تھا وہ اس لیے تھا کہ وہ غیروں کی حکومت تھی۔ ظلم وجبر اس کا شیوہ تھا۔ان کے سامنے وفاداری کا ثبوت دینا اور ان کی حکومتی پالیسیوں سے چار وناچار اتفاق کرنا ایک قسم کی مجبوری میں شامل تھا۔یہ وفاداری عیب کے بجائے باعث فخر وہنر ہو سکتی تھی کہ ظالم حکومت کا نشانہ بننے سے خود کو محفوظ رکھنے کی ایک تدبیر ہو سکتی تھی حالانکہ عالی حوصلہ اور باہمت مسلمانوں کے

---

[۱۵] ماخذ سابق ص ۹۳-۹۴

[۱۶] ماخذ سابق ص ۲۶۰

نزدیک یہ رویہ بھی صحیح نہیں تھا لیکن افسوس ہے کہ آزادی کے ستر سال بعد آج بھی مسلمان اگر اس رویہ کو اپنا شیوہ بنائیں اور حکومت سے وفاداری کا ثبوت پیش کرنے پر مجبور ہوں تو اس میں ایک ہی فریق قصوروار یقیناً نہیں ہے۔اس کے پیچھے ایک خاص قوم کی تحقیر وتذلیل اور ان کو ان کے ملی، دینی، سیاسی اور تہذیبی حقوق سے محروم کرنے کا جذبہ ہے جو کام کر رہا ہے۔اس کے ازالہ کے لیے محروم طبقہ کو ٹھنڈے دماغ سے سوچنا پڑے گا۔ آزادی کے بعد یہ کیفیت دور اس لیے ہو جانی چاہئے تھی کیوں کہ یہ ملک مسلمانوں کا بھی اتنا ہی ہے جتنا دوسروں کا ہے۔ آزادی کی جد وجہد میں ان کا بھی حصہ ہم سایہ قوموں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔اس کا سب سے اہم اور بڑا ثبوت یہ ہے کہ تقسیم وطن کے وقت مکمل اختیار کے باوجود اس مٹی میں رہنا اور اس کی ترقی وحفاظت و بقا کے لیے ہر قسم کا ایثار پیش کرنا مسلمانوں نے اپنا فرض اولین سمجھا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کیفیت میں اب تک تبدیلی نہیں آئی۔آج بھی مسلمان اپنے حقوق کے حصول اور اس کی بازیافت کے لیے وفاداری کی سند حاصل کرنے کے لیے مجبور ہیں اور قدم قدم پر انہیں ملک و وطن سے وفاداری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔اللہ جانے کب یہ صورت حال تبدیل ہو گی؟۔

مختصر یہ کہ مولانا کی یہ آپ بیتی صرف آپ بیتی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے ہندوستان کے علمی، تعلیمی، ملی، قومی، سیاسی اور ایک خاص علاقہ کے تہذیبی حالات کی چشم دید گواہی سے عبارت ہے۔اس میں ملک کے موجودہ علما، ملی وسیاسی قائدین، اخبارات ورسائل کے مدیروں، درس گاہوں کے منتظموں اور نفس ومعاشرہ کی اصلاح کرنے والے معلموں اور اساتذہ کے لیے رہنمائی موجود ہے۔

---


## فارم IV (رول نمبر ۸)

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| نام پریس | : | معارف پریس، اعظم گڑھ | نام پبلشر | : | ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی |
| مقام اشاعت | : | دارالمصنفین اعظم گڑھ | قومیت | : | ہندوستانی |
| وقفۂ اشاعت | : | ماہانہ | پتہ | : | دارالمصنفین اعظم گڑھ |
| نام پرنٹر | : | ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی | ایڈیٹر | : | ڈاکٹر ظفر الاسلام خان |
| قومیت | : | ہندوستانی | قومیت | : | ہندوستانی |
| پتہ | : | دارالمصنفین اعظم گڑھ | پتہ | : | دارالمصنفین اعظم گڑھ |

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

میں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

# مکتوب نگاری کی نئی تحقیق

ڈاکٹر راہی فدائی

موبائل نمبر:9448166536

قرآن مجید علوم و فنون کا سر چشمہ ہے، جہان رنگ و بو کے مفید و مستند ست رنگ علمی و ادبی اشارے کتاب اللہ میں جا بجا جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہی اس مقدس کلام ربانی کا اعجاز ہے۔بقول مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی:

> قرآن مجید کے نازل ہونے پر لوگ اس کے معجزہ ہونے کو محسوس کر کے ہی متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کو خدا کا کلام دل سے تسلیم کیا اور اس کی خصوصیت بتانے میں انسان کے کلام کے اقسام کا ذکر کر کے ہر ایک سے اس کو الگ قرار دیا اور جیسے جیسے علم کا چرچا بڑھا اور علمی غور و فکر کا رواج ہوا، ادب اور فلسفہ کے ماہرین نے قرآن مجید کی خصوصیت پر غور کرنے کی کوشش کی، ان کوششوں میں سے متعدد کو اعجاز قرآنی سے تعبیر کیا گیا۔[1]

قرآن مجید نے جن علوم و فنون کی طرف رہنمائی فرمائی ہے ان میں اعلیٰ فصاحت و بلاغت سے آراستہ و پیراستہ ادب عالی کی جلوہ سامانیاں چشم بصیرت کو خیرہ کرنے کے لئے کافی ہیں، بقول مولانا قاضی مجاہد الاسلام:

> خالق کائنات خود سمیع و علیم اور بصیر و قدیم ہے اس لئے اس کے کلام میں ادب عالی کی تمام ارفع بنیادیں اور حسن کلام کی تمام اعلیٰ فنی خوبیاں اور ادبی محاسن، اوزان و فواصل کا رنگ، مسحور کن تنوع بدرجہ کمال پایا جاتا ہے۔[2]

ادب عالی کے شستہ اصناف میں انشا بھی ایک ہے جس کی ذیلی قسم مکتوب نگاری ہے۔ جس طرح ادب کی اصناف مثلاً قصہ نگاری کی عمدہ مثال قرآن کریم میں سورۂ یوسف ہے جسے ''احسن القصص'' کہا گیا ہے، اسی طرح مکتوب نگاری کا بہترین نمونہ کلام پاک کی سورۂ مزمل ہے جس میں مکتوب نگاری کے اجزائے

---

[1] قدرت اللہ حسینی باقوی، سید شاہ پروفیسر، ''فنون القرآن'' یعنی قرآن کریم کا صوتی، فکری، ادبی و علمی آہنگ، دار قدرت ۱۵۵، ادے گری، میسور، ۲۰۰۴ء، ص:۱۱

[2] ماخذ سابق ص:۸

ترکیبی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مکتوب نگاری کا اولین جز مکتوب الیہ سے خطاب یعنی جس کو مکتوب روانہ کیا جارہا ہے، اس کے نام یا اس کی کسی مخصوص صفت کے ذریعے اس سے مخاطب ہونا، کاتب تقدیر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندے خاتم المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو " یاٰیھاالمزمل " یعنی "چادر لپیٹے ہوئے میرے محبوب" کے عنوان سے مخاطب فرمایا ہے۔ یہ وصفی اسم گرامی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عارضی طور پر طاری اضطراب و رنج کی کیفیت کو دور کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و ملاطفت کا اظہار فرمانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وقتی حالت کی مناسبت سے خطاب فرمایا جب کہ سرداران قریش دارالندوۃ میں جمع ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کاہن، مجنون، ساحر وغیرہ الفاظ سے پکارنے پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا ملال ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فکر و اضطراب کی حالت میں خود کو کپڑوں میں لپیٹے رہے۔ رب تعالیٰ کو اپنے محبوب کی یہی ادا پسند آگئی تو " یاٰیھاالمزمل " سے خطاب فرمایا۔

مکتوب نگاری کا دوسرا اور اہم جز مواد و مقصد ہے۔ مکتوب نگار اپنے کسی بزرگ کو خط لکھ رہا ہے تو مکتوب کے الفاظ میں احتیاط و التجا کا پہلو نمایاں رہے گا، اگر دوست کے نام خط ہے تو اس کا اسلوب قدرے بے تکلفانہ ہوگا اور اگر کوئی بزرگ اپنے لاڈلے کو مکتوب ارسال کر رہا ہے تو اس کا انداز نہایت مشفقانہ اور انتہائی مخلصانہ ہوگا، جس میں اپنے پیارے کو بڑے ملاطفت و بے حد محبت کے ساتھ نصیحت کی جائے گی، اپنے محبوب کو منوانے کے لئے مختلف مثالیں پیش کی جائیں گی اور اپنے چہیتے کی ہمت افزائی کرتے ہوئے مقصد کی بات آگے بڑھائی جائے گی، جیسا کہ سورۂ مزمل میں اللہ رب العزت نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز تہجد میں پوری رات صرف کرنے اور عبادت کے لئے تمام شب وقف کرنے سے روکنے کے لئے جس الفت و محبت سے لبریز شیریں لہجہ اپنایا ہے وہ فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ وارفع آخری حد ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "یٰاَیُّھَاالْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّیْلَ اِلاَّ قَلِیْلاً o نِّصْفَہٗ اَوِنْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلاً o اَوْزِدْ عَلَیْہِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً" o یعنی اے میرے لاڈلے نماز کے لئے رات کا تھوڑا ہی وقت لگاؤ، آدھی رات کا یا اس سے بھی کم یا کچھ زیادہ (مگر محبوب رات بھر نماز کے لئے صرف نہ کریں تھوڑی دیر سہی آرام فرمالیں)۔ اے میرے محبوب آپ کو دن میں بہت کام رہتا ہے (اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلاً)۔ آپ طعن و تشنیع کرنے والوں کی پرواہ نہ کیجئے، صبر کرتے رہئے۔ اللہ تعالیٰ جو مشرق و مغرب کا رب ہے ان سے آپ کا بدلہ لے گا۔ (رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَااِلٰہَ اِلاَّ ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلاً o وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْ ھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلاً)۔ اسی طرح رب العالمین نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو دلاسہ

دلایا، بڑے پیارے اور بڑے ہی نرالے انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت افزائی فرمائی، مشرکین مکہ کے مقابلے میں فرعون کی مثال دی، اس کی نافرمانی کا اجمالی تذکرہ کرکے اس کا انجام بھی بتادیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین واعدا کو تنبیہ ہو جائے اور آپ کے قلب مبارک کو تسکین حاصل ہو۔
مکتوب نگاری کا آخری جز مکتوب نگار کے نام کی صراحت، خط تحریر کرنے والا آخر میں اپنے دستخط ثبت کرے گا اور اپنا نام ظاہر کرے گا ورنہ اس خط کی قدر و قیمت پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ سورۂ مزمل میں خداوند قدوس نے اختتام کے موقع پر اپنا اسم گرامی مع صفات عالیہ کا ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ''ان اللہ غفور رحیم''۔ اس طرح رب تعالیٰ نے گویا اپنے دستخط ثبت فرمادیے۔ بہر حال مذکورہ بالا تفصیل و توضیح کو پیش کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مکتوب نگاری کا بہترین نمونہ قرآن پاک میں سورۂ مزمل کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

مذکورہ بالا تمہید کے بعد ایک عجیب و غریب سوال ذہن کے پردے پر روشن ہوتا ہے کہ اس عالم آب و گل کا اولین مستند و معتبر مکتوب کس نے تحریر کیا اور وہ کس کے نام تحریر کیا گیا۔ اس کا بھی صحیح ترین جواب قرآن مجید و فرقان حمید میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت سلیمان بن حضرت داؤد علیہما السلام نے ملکہ سبا بلقیس کے نام خط لکھا، جس کا ذکر خیر اللہ تعالیٰ نے بڑے اہتمام سے اپنے کلام میں محفوظ فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کے نام خط لکھ کر ہدہد پرندے سے فرمایا: ''اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ ٥ قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّیْۤ اُلْقِیَ اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ ٥ اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥ (سورۂ نمل آیت: ۲۸۔۲۹۔۳۰) یعنی حضرت سلیمان نے ہدہد کو حکم دیا کہ میرا یہ خط لے جا اور ان کے پاس ڈال دے اور وہاں سے ذرا ہٹ کر یہ بھی دیکھ کہ وہ اس خط کو اچانک دیکھ کر کیا ردّ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ ملکہ بلقیس اس دور کی تعلیم یافتہ حکمراں تھی۔ اس نے خط پڑھا تو اپنے درباریوں سے کہا: ''میرے پاس سلیمان کی طرف سے ایک معزز مکتوب آیا ہے جس کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کی گئی ہے''۔
قرآن مجید کی اس صراحت سے یہ بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ شاید دنیا کا اولین مکتوب وہی تھا جس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کے نام رقم کیا تھا۔ علاوہ ازیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے مختلف حکمرانوں کے نام جو خطوط لکھوائے تھے وہ بھی مکتوبات کا قدیم بیش بہا سرمایہ اور مکتوب نگاری کی محفوظ تاریخ کا اولین ماخذ ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اردو کے قدیم ترین مکاتیب کے مآخذ و مصادر کون ہو سکتے ہیں۔ اس کا اطمینان

بخش جواب تلاش کرنے سے پیشتر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اردوئے قدیم یعنی دکنی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اردو شعر وادب کے اکثر اصناف کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے جس طرح اردو کی اولین شعری کائنات حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ) کی مقدس جھولی سے نکلی ہے[۳]۔ اور اردو کے اولین نقاد علامہ باقر آگاہ ویلوری (متوفی ۱۲۲۰ھ) کے مقدمات نقد و انتقاد کی اولین مثالیں ہیں[۴]۔ اسی طرح بقول پروفیسر محمد علی اثرؔ، اردو کے قدیم ترین خطوط نظم کی ہیئت میں ملتے ہیں۔ حیدر آباد کے شیر محمد خاں ایمانؔ (متوفی ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء) کے ''نامہ منظوم'' سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۸۰۳ء سے قبل بھی اردو نظم و نثر میں مکتوب نگاری کی روایت رہی ہے۔ ایمانؔ نے اپنے منظوم خط کسی نثری خط کے جواب میں اپنی وفات (۱۸۰۵ء) سے پہلے اور غالبؔ کی وفات (۱۸۶۹ء) سے ۶۴ سال قبل تحریر کیا تھا۔ جہاں تک اردو میں منظوم خطوط کا تعلق ہے، سب سے قدیم خطوط ۱۱۷۵ھ سے قبل اور غالبؔ کی ولادت ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) سے ۳۶ برس پہلے دور آصف جاہی (سلطنت آصف جاہی، حیدر آباد) کے منصب داروں مرزا بیگ اور میر ابراہیم کے درمیان تحریر کئے گئے تھے، جس کا مخطوطہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد میں ایک بیاض کی صورت میں محفوظ ہے[۵] (مخطوطہ نمبر ۱۱۳۰ ص: ۲۸۹)۔

اردو کے قدیم مکتوبات میں حضرت سید عارف شاہ قادری خلیفہ حضرت سید شاہ صدر الدین حسینی نلنگلی مصنف مصباح النور و مفتاح النور ابن سید شاہ میراں حسینی آرکاٹی ملقب بہ منزوی الجبلین (متوفی ۱۱۴۰ھ)[۶] کا وہ خط بھی ہے جس کو آپ نے اپنے مخلص دوست غلام علی صاحب کے نام تحریر کیا تھا۔ حضرت عارف شاہ بھی اپنے شیخ کی طرح صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ نے اپنے رفیق دیرینہ غلام علی کی خواہش و فرمائش پر ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں ''حقوق المسلمین'' نامی رسالہ لکھا تھا[۷]۔

علاوہ ازیں جنوبی ہند کے مشہور و معروف بزرگ علامۂ وقت مصلح و مصنف حضرت سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری معروف بہ قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) نے بڑی عمر میں انگریزی زبان سیکھ

---

[۳] راہی فدائی، ڈاکٹر، ''جنوب کے اصحاب کمال'' (جلد اول)، الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد، ۲۰۱۹ء، ص: ۳۰

[۴] ماخذ سابق ص: ۲۳۷

[۵] محمد علی اثر پروفیسر، ''مکاتیب مشاہیر'' ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۴-۲۵

[۶] راہی فدائی ڈاکٹر، ''گنج شائگاں'' (مقدمہ) الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۸

[۷] حبیب النساء بیگم، پروفیسر، ''جواہرات میسور'' بنگلور، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۳

کراسی زبان میں ملکہ برطانیہ وکٹوریہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس غیر معمولی واقعے کا ذکر مولانا سید عبدالحی حسنی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف نزہۃ الخواطر میں کیا ہے۔ آپ (حضرت قطب ویلور) نے اردو میں ایک طویل خط ویلور (ٹمل ناڈو) کے انگریز کمشنر لوئن صاحب کے نام تحریر کیا تھا، جب کہ ۱۲۵۵ھ میں بعض معاندین نے آپ پر یہ الزام لگایا کہ آپ اپنی وعظ و نصیحت کی مجلسوں میں انگریز حکومت کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں[۸]۔ اس گرانقدر مکتوب کا عکس رفیق محترم ڈاکٹر بشیر الحق لطیفی نے اپنی کتاب ''مکتوبات قطب ویلور'' میں شائع کیا ہے۔[۹]

مکتوب درحقیقت کاتب کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کاتب ازل جل جلالہٗ نے پہلے پہل جب قلم کی تخلیق کی اور اس سے کہا کہ لکھ! تو قلم نے لوح محفوظ پر وہی لکھا جو تقاضائے ''کن'' تھا۔ اسی لئے صفحہ کائنات کے ہر حرف بلکہ ہر نقطے سے کاتب ازل کے نور کبریائی کا ظہور ہوتا ہے جس سے دیدۂ بینا ورطۂ حیرت میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔

خط اگر افادۂ عام کے خیال سے زیب رقم کیا گیا ہو تو اس کی حقیقت مقالہ و مضمون کی سی ہو جائے گی، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ خطوط ہیں جو ''غبار خاطر'' میں شامل ہیں۔ جب خطوط میں احتیاط و اجتناب کا احساس دامن گیر ہو تو بے خطر آتش شوق میں کود پڑنے کی ادائے دل ربائی دھری کی دھری رہ جائے گی بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:

> عزیزوں اور رفیقوں کے نام جو خط عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور روزمرہ پیش آنے والے حالات و واقعات کے ماتحت ان کا رنگ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے فکر و اہتمام سے انہیں کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی، نہ وہ سوچ بچار کر کے لکھے جاتے ہیں، نہ ان میں کوئی دخل عبارت آرائی کو ہوتا ہے، نہ ان پر نوبت نظر ثانی کی آتی ہے، بس جس طرح انسان بے تکلف اپنے بیوی، بچوں، بھائی بندوں، دوستوں، رفیقوں سے بات چیت کرتا ہے، یہ نجی خط بھی اسی طرح سادہ زبان میں اور قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں۔[۱۰]

مکتوبات شخصی دستاویز بھی ہیں اور تہذیبی و سماجی اقدار کے عکاس بھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کسی ادب

---

[۸] راہی فدائی، ڈاکٹر، ''خانقاہ اقطاب ویلور کے علمی آثار'' الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۶ء، ص: ۳۰۸

[۹] بشیر الحق، ڈاکٹر، ''مکتوبات حضرت قطب ویلور'' دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور، ۲۰۱۲ء، ص: ۵۳۲

[۱۰] دیباچہ ''مکتوبات سلیمانی''، جلد دوم مطبوعہ ۱۹۶۷ء، شاہی پریس، لکھنؤ ص: ۳

پارے کی تحقیق وتدوین کے موقع پر اس کے متن سے متعلق دستیاب مکاتیب کا مطالعہ ضروری سمجھا گیا ہے بقول پروفیسر معین الدین عقیل:

ہمارے ادب کے مطالعے میں ادب کے وسیلے سے تہذیبی، معاشرتی عہد و ماحول اور تاریخ کے سمجھنے میں اور مقصود مطالعہ شخص کے حالات وافکار کو پوری طرح سمجھنے اور متعین کرنے میں خطوط یا مکاتیب ناگزیر ہورہے ہیں۔[11]

مکتوبات کی مذکورہ افادیت کے باوجود بعض اہل علم واصحاب قلم حین حیات خطوط کی اشاعت کو نامناسب سمجھتے ہیں بقول ڈاکٹر ذاکر حسین: ''البتہ خطوط کے معاملے میں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخصی دستاویز ہی ہوتے ہیں، اس لئے اشاعت سے کم از کم لکھنے والوں کی زندگی میں احتراز کرنا چاہئے۔''[12]
حاصل کلام یہ کہ مکتوبات کی اشاعت کے مثبت ومفید پہلو پر نظر کرتے ہوئے اکثر قلمکاروں نے انہیں منظر عام پر لانے کو صحیح اور مناسب خیال کیا ہے۔



---

[11] ''مکاتیب مشاہیر''ص:۸

[12] راہی فدائی، ڈاکٹر ''محمد نظام الحق عابدؒ اوراق جاوداں''(مکتوبات مشاہیر عظام، حکیم محمد نور الحق جاوید کے نام) ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس، ۱۹۹۴ء، ص:۸۰۔۸۱

# مسلمانوں کے سیاسی امور: ہندوستانی تناظر میں


## محمد احتشام الحسن

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ
ahtesham.media@gmail.com


ہندوستانی میڈیا میں ایک بڑا مسئلہ سیاسی امور سے دانستہ یا غیر دانستہ چشم پوشی ہے۔ حالانکہ یہ ہر سیاسی جماعت کی پالیسی کا مقصد ہونا چاہئے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے آج تک اپنے طور پر اپنی کوئی سیاسی حیثیت متعین نہیں کی ہے۔ جو جماعتیں سیاست کے میدان میں سر گرم ہیں وہ عملی طور پر مسلمانوں کے مسائل سے مکمل خاموش نہیں تو بڑی حد تک خاموش دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم قوم کے سیاسی رجحان و فکر کی بنیادیں بڑی حد تک کمزور ہیں۔

سید سعادت اللہ حسینی اپنے ایک مضمون ''ہندتوا اور مسلم سیاست'' میں رقم طراز ہیں:

> سیاست دراصل تبدیلی کا ہی نام ہے۔ سیاسی افکار کا مقصد ہی یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہم کو (تبدیلی کے کسی وژن پر) مجتمع کریں اور یہ یقین پیدا کریں کہ ہم اپنا مستقبل خود تشکیل دے سکتے ہیں۔ سیاسی وژن نہ ہو تو ہم محض حالات کے سیاسی دھارے میں اپنے بہاؤ کے تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔[1]

آبادی میں بتدریج اضافہ، تعلیمی معیار میں سدھار اور میڈیا کے پھیلاؤ نے عام آدمی کو اپنے حق اور بقا کے لئے جدوجہد کا جو راستہ دکھایا ہے اس نے سیاست کو پھلنے پھولنے کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ آبادی میں اضافہ کے حوالے سے تجزیہ نگار مختلف الرائے ہیں۔ بعض تجزیہ نگار مانتے ہیں کہ قومی آبادی میں اقلیتی فرقوں پر مشتمل آبادی میں اضافہ اور اکثریتی آبادی میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ صورت حال کسی ایک فرقے یا صوبے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر صوبائی آبادی میں اقلیتی آبادی کا مستحکم طریقہ سے بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ قومی آبادی میں کسی بھی فرقے کی آبادی میں مسلسل اضافہ نیک فال ہے۔ سماجی تحفظ اور اجتماعی طاقت حاصل کرنے کی غرض سے اقلیتی آبادی میں اضافہ ناگزیر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کا جمہوری طرز انتخابات مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق آبادی میں اضافے کے ساتھ چناؤ کی نشستوں کی تقسیم اس طرح کرتا ہے جس سے ہر علاقے میں آبادی اور نشستوں کا تناسب یکساں

---

[1] زندگی نو، ماہنامہ، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۲۱

رہے۔

پروفیسر رؤف الرحمن اپنی کتاب ''ہندوستان کی اقلیتی آبادی: مسائل وامکانات'' میں رقم طراز ہیں:

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم آبادی میں بتدریج اضافہ اس فرقہ کو سیاسی طور پر مضبوط اور طاقت ور بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ ہندوستان کی مجموعی آبادی میں مسلمان [۲۰۱۳ میں] ۱۳.۴ فیصد ہیں۔ اگر آبادی کے تناسب کو مدنظر رکھا جائے تو لوک سبھا کی ۵۴۵ نشستوں میں مسلمانوں کا حصّہ ۶۵ نشستوں تک بنتا ہے۔ لیکن پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی [۲۰۱۳ میں] ۲۵ نشستوں سے بھی کم ہے۔[۲]

بعض تجزیہ نگاروں کی رائے ہے کہ مسلمانوں اور دوسری اقوام کی موجودہ آبادی کے تناسب کی بنیاد پر پروفیشنل ڈیموگرافرز کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے کہ مسلمانوں کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اگر آبادی ناپنے کے پیمانے جیسے خواتین کی اوسط عمر، شرح باروری اور چھوٹے بچوں میں اموات کی شرح وغیرہ جیسی تمام بنیادوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کی شرح توقع سے کم ہے۔ ابوصالح شریف اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مسلمانوں کی آبادی ۱۳.۴ فی صد سے بڑھ کر ۱۴.۲ فی صد ہوگئی ہے اس میں ۰.۸ کا اضافہ ہوا ہے لیکن یہ اضافہ پچھلی دہائیوں کی بہ نسبت کم ہے۔ مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کے بالمقابل زیادہ تیزی سے بڑھنی چاہئے تھی کیوں کہ ان کی اوسط عمر اور شرح باروری ہندوستان کے دوسرے سماجوں کے بالمقابل بہتر ہے۔ ۲۰۱۰ میں ہندوستانی مسلمان کی اوسط عمر ۲۲ سال تھی، اس کے بالمقابل ہندوؤں کی ۲۶ اور عیسائیوں کی اوسط عمر ۲۸ سال تھی۔[۳]

اگر زمینی سطح پر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ تقسیم ہند کے ۷۵ برس کے بعد بھی کیا مسلمانوں کا کوئی ایسا لیڈر موجود ہے جو پوری قوم کی نمائندگی کرتا ہو۔ اس سوال کا جواب یقینا نفی میں ملے گا۔ اگر کوئی لیڈر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر مسلمانوں کے حالات بہتر ہوتے اور ان کی سیاسی فکر مستحکم ہوتی اور مسلمانوں کے حالات بہتر بنانے میں وہ کلیدی کردار ادا کرتے۔

مسلمانوں کی قلیل نمائندگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں ٹکٹ دینے میں سیاسی حکمت عملی

---

[۲] پروفیسر رؤف الرحمن خان، ہندوستان کی اقلیتی آبادی، مسائل وامکانات، ایڈ شات پبلی کیشن، ممبئی، ۲۰۱۳، ص ۶۰

[۳] زندگی نو، مارچ ۲۰۲۱، جلد ۴۷، شمارہ: ۳، ص۔ ۱۰۱

دکھاتے ہوئے مضبوط امیدوار کو ٹکٹ نہیں دیتیں اور اگر دیتی بھی ہیں تو ایسے علاقے سے جہاں اس پارٹی کے کسی بھی امیدوار کے کامیاب ہونے کی امید نہ ہو یا پھر ایسے علاقے سے جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ ایسے حلقوں میں تمام غیر بھاجپائی پارٹیاں ایک مخصوص حکمت عملی کے تحت مسلم امیدوار ہی کھڑا کرتی ہیں جس کے نتیجے کے طور پر اس حلقے میں مسلم ووٹ تقسیم ہو جاتے ہیں اور غیر سیکولر کہی جانے والی پارٹی کے امیدوار بہت کم ووٹ کے فرق سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ آبادی کی مناسبت سے جو حصّہ داری ہونی چاہئے تھی اس میں اضافہ کی بجائے تخفیف ہو رہی ہے، کیوں کہ مسلمانوں کی مسیحا سمجھی جانے والی سیکولر سیاسی پارٹیوں نے مسلمانوں کو سیاست میں حصّہ دار بنانے کی کے لیے کوئی ٹھوس عملی قدم نہیں اٹھایا، جس کا نتیجہ ہے کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں آج پہلی بار مرکزی حکومت اور ۱۶ ریاستوں کی حکومتوں میں کوئی مسلم وزیر نہیں ہے۔ پارلیمان میں حکمران جماعت کا کوئی بھی مسلمان رکن نہیں۔ بی جے پی کے پاس اس وقت لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں ۳۹۴ ممبران پارلیمان اور ملک بھر میں ۱،۳۷۹ ایم ایل اے ہیں اور اس میں مسلمانوں کی حصّہ داری لمحہ فکریہ ہے اور یہی حال حکومت میں شرکت کا بھی ہے۔

پارلیمان میں مسلمانوں کی نمائندگی کا سب سے بڑا دور ۱۹۵۲ تھا۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ۱۰ فیصد تھی، جبکہ لوک سبھا میں مسلمان ممبران کی تعداد ۴ فیصد تھی۔ وہیں ۲۰۱۹ میں مسلمانوں کی آبادی بڑھ کر ۱۴.۵ فیصد ہوگئی، لیکن لوک سبھامیں مسلم ممبران کی تعداد ۴.۹ فیصد رہی۔

مسلم آبادی والی ٹاپ نو ریاستوں میں مسلم ممبران اسمبلی کی تعداد پر نظر دوڑائیں تو آزادی کے بعد سے ہی تعداد میں کمی واقع ہونے لگی۔ ۱۹۶۱ سے ۲۰۱۹ تک سب سے زیادہ تقریباً ۲۸ فیصد مسلم آبادی والی ریاست آسام میں کل منتخب مسلمان ممبران اسمبلی کی تعداد ۱۹ فیصد ہے۔

مرکز اور ریاستی حکومتوں میں مسلم وزراء کی حصّہ داری کی بات کریں تو خواہ ملک میں مسلمانوں کی دوسری سب سے بڑی آبادی ہو، لیکن اس وقت مرکزی حکومت میں ایک بھی مسلم وزیر نہیں ہے۔ مرکزی حکومت کے قومی اقلیتی کمیشن میں سب سے بڑی اقلیتی طبقے کا صرف ایک ممبر ہے۔
ٹاپ ۹ مسلم آبادی والی ریاستوں میں مسلم نمائندگی کی صورتحال کچھ اس طرح ہے: مغربی بنگال میں کل وزراء ۴۸ جس میں مسلم وزراء ۱۷ فیصد، کیرالا میں کل وزراء ۲۰ جس میں مسلم وزراء ۱۵ فیصد، آسام میں کل وزراء ۱۶ جس میں مسلم وزراء ۰ فیصد، یوپی میں کل وزراء ۵۳ جس میں مسلم وزراء ۱.۸ فیصد،

بہار میں کل وزراء۳۱ جس میں مسلم وزراء ۶.۴۵ فیصد، کرناٹک میں کل وزراء۲۹ جس میں مسلم وزراء۰ فیصدآندھراپردیش میں کل وزراء۲۴ جس میں مسلم وزراء۱۶.۴ فیصد، راجستھان میں کل وزراء۳۰ جس میں مسلم وزراء۷ فیصداور گجرات میں کل وزراء۲۵ جس میں مسلم وزراء۰ فیصد کی تعداد میں ہیں۔اگر مجموعی اعتبار سے بات کی جائے تو کل۲۷۶ وزراء میں صرف۶ فیصد مسلم وزراء ہیں۔[۴]

۲۰۱۹ میں لوک سبھا کی تقریباً۵۶ فیصد سیٹوں پر جیت حاصل کرنے والی برسراقتدار پارٹی میں ایک بھی مسلمان ایم پی نہیں ہے۔۲۰۱۴ کے لوک سبھا انتخابات میں بی جے پی نے ۷ سیٹوں پر مسلم امیدوار میدان میں اتارے تھے جبکہ ۲۰۱۹ میں ۶ مسلم امیدوار بنائے گئے۔راجیہ سبھا کے کل ۲۴۵ ممبران میں سے حال میں ۹۱ ممبران بی جے پی کے ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں ہے(بعد میں جموں وکشمیر کے غلام علی کھٹانا کو راجیہ سبھا ممبر نامزد کیا گیا)۔ قابل ذکر یہ بھی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کا دعویٰ کرنے والی بی جے پی کا ملک کی ۲۸ ریاستوں اور ۲ مرکز کے ماتحت علاقوں میں ایک بھی مسلم ایم ایل اے نہیں ہے۔ لیکن تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ بی جے پی کے فکر سے متفق نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس کو ووٹ بھی نہیں دیتے ہیں خواہ بی جے پی نے مسلم امیدوار ہی کیوں نہ میدان میں اتارے ہوں۔ لہذا پارٹی ایسی کمیونٹی کے شخص کو ٹکٹ کیوں دے گی۔

یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ملک کی اقتصادی ترقی میں مسلمان بہت پیچھے ہیں، اس کا سبب اعلی تعلیم کا فقدان ہے۔ بعض نوجوان اس لئے پیچھے ہیں کہ ان کے پاس ملک کے مین اسٹریم میں جڑنے کے مواقع اور وسائل بہت کم ہیں اور بعض اس لئے پیچھے ہیں کہ انہیں اس بات کی فکر ہی نہیں کہ یہ بھی کوئی مسلمانوں کی ترقی کا موضوع ہے۔ وہ وسائل ہوتے ہوئے بھی اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اپنی فیکٹری یا کارخانے کی آمدنی میں گم رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم بہتر پوزیشن میں ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر وہ مثبت فکر کے ساتھ اپنے بچوں کو اعلی تعلیم نہیں دلا سکتے تو ایسے نوجوانوں کو تلاش کرنا کوئی مشکل نہیں جو محض وسائل نہ ہونے کے سبب بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انہیں تلاش کرکے آگے لانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ آگے آئیں اور فارغ البال زندگی جینے کے ساتھ ساتھ قوم کی سیاسی فکر کا حصّہ بنیں اور یہ سوچیں کہ انہیں اب کیا کرنا چاہئے اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔

مسلمانوں کے مین اسٹریم میں پیچھے رہ جانے پر روشنی ڈالتے ہوئے اور تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے سید

---

[۴] https://dailysalar.com/news/71241/urdu-news-paper/

سعادت اللہ حسینی نے لکھا ہے:

جدید فرقہ پرستی کی تاریخ کا آغاز ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی سے ہوتا ہے۔ یوں تو اس تحریک میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی حصّہ لیا تھا لیکن انگریزوں کے غیظ و غضب کا نشانہ خاص طور پر مسلمان بنے۔ اس وقت تک شمالی ہند میں خوش حال معیشت کا بڑا انحصار سرکاری عہدوں و نوکریوں اور زمینداری پر تھا۔ انگریزوں نے منظم و منصوبہ بند کوشش کی کہ مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، تہذیبی و سماجی ہر طرح کی قوت کو پوری طرح کچل دیا جائے۔ اس پالیسی نے مسلمانوں میں انگریزوں سے ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب، تعلیم اور نوکریوں سے بھی شدید نفرت پیدا کر دی اور مسلمان ہر محاذ پر پچھڑتے چلے گئے۔ کچھ ہندو رہنماؤں نے انگریزوں سے قربت پیدا کی اور تعلیمی و معاشی ترقی کے جو مواقع انگریزی اقتدار نے پیدا کئے تھے ان کا بھرپور استعمال شروع کر دیا۔ نتیجتاً ملک میں مسلمان پہلی بار اس صورتحال سے دوچار ہوئے کہ مختلف فرقوں کے لوگ ہر محاذ پر نہ صرف ان کے مقابلے میں کھڑے تھے، بلکہ ان کو پیچھے چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک طرف مسلمانوں میں اس کا فطری ردعمل تھا اور دوسری طرف ہندوؤں کے بعض طبقوں کے لئے یہ صورتحال مسلمانوں کو پیچھے کرنے اور بدلہ لینے کا موقع تھی۔ انگریزوں نے جنگ آزادی (انگریز غدر کہتے تھے) کے انتقام میں سرکاری ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں کے لئے بند کر رکھے تھے۔ ان کو کھولنے کی کوششیں ہوئیں تو بعض ہندو دانشور نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ یہ جدید فرقہ وارانہ کشمکش کا آغاز تھا۔ انگریزی اقتدار کی بقا کے لئے بھی ضروری تھا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کی فضا بنی رہے۔ اس کشمکش کو استعمال کر کے انہوں نے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کے بیج بونا شروع کر دیے۔[۵]

قابل ذکر یہ بھی ہے کہ اس وقت سر سیّد احمد کی ذکی الفہمی کی وجہ سے انگلو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ انہیں فتوؤں اور لعن طعن کا بھی سامنا کرنا پڑا، باوجود یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے ایک عظیم فیصلہ لیا۔ نتیجتاً آج مسلم سماج میں علیگ برادری اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبائے قدیم ملک کے مختلف عہدوں پر فائز ہیں خواہ وہ سیاسی امور سے متعلق ہوں یا پھر سیاست سے جہاں بھی ہیں وہاں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

---

[۵] زندگی نو، اکتوبر ۲۰۲۱

۱۹۹۲ میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کا سیکولرزم بے نقاب ہو گیا اور مسلمان اس پارٹی سے اتنا متنفر ہوئے کہ کچھ عرصے کے لئے سیاسی حاشیے پر چلی گئی۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ اس کے بعد بھی کوئی فراخدلانہ سلوک نہیں کیا گیا اور نہ ان کے جائز حقوق تسلیم کئے گئے بس صرف طفل تسلیاں دی جاتی رہیں۔

کانگریس دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد جسٹس راجندر سچر کمیٹی قائم ہوئی، اس کی اکثر سفارشات آج تک سرد خانے میں ہیں۔ اکثریتی فرقہ کے ساتھ نرم رویّہ اختیار کیا گیا لیکن اس سے بھی پارٹی کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ سیاست داں بدلتے رہے لیکن ان کی سیاست وہی رہی۔ تمام پارٹیاں چاہے وہ سیکولرزم کی حامی ہوں یا غیر حامی سب کی صورت حال یکساں ہے۔ بعض دانشوروں نے مسلمانوں کو اپنی سیاسی پارٹی بنانے کی باتیں کیں لیکن اس سے بھی کوئی بھلا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے جتنے قائد ہیں وہ پورے ملک کے عوام کو اپنے ساتھ رکھنے سے قاصر ہیں۔ مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ سیاسی بصیرت کا ثبوت نہیں دیتے لیکن یہ تو پتہ چلے کہ سیاسی بصیرت کا ثبوت کس کو چاہئے اور کیوں چاہئے۔[6]

مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت ہر پارٹی کو رہی ہے لیکن ان کے سیاسی امور سے کسی پارٹی کو دلچسپی نہیں رہی ہے۔ الیکشن کے وقت چند سرکردہ مسلم لیڈروں کو آگے کر کے ووٹ حاصل کرتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں کہ مسلم قوم بھی یہاں کوئی موجود ہے۔ لیڈروں کے ارد گرد رہنے والے لوگ ان سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں اور پسماندہ طبقات کو معمولی چیزیں تقسیم کرا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں اس بات سے بھی ڈرتی ہیں کہ ان پر مسلمانوں کی چاپلوسی کے الزامات نہ لگ جائیں۔ اس لئے وہ اکثریتی طبقے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کھل کر مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر نہیں چلتیں، جس کے سبب مسلمان کمزور طبقات ہوں یا اشرافیہ، یہ پارٹیاں بس دکھانے کے لئے ان کے سامنے آتی ہیں۔ جتنی چھوٹی یا علاقائی پارٹیاں ہیں، ان کی سیاسی عزائم کچھ بھی رہے ہوں وہ مسلمانوں کو یہ باور کراتی ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ہیں اور ان کی سیاسی امور میں دلچسپی رکھتی ہیں حالانکہ زمینی سطح پر ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ جبکہ کانگریس پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی پارٹی ہے لیکن حالات نے ثابت کیا ہے کہ وہ بھی دوسری پارٹیوں کی طرح ہی اپنی سیاست کر رہی ہے۔ پھر بھی ایک پارٹی کی جانب

---

[6] ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد، ''ملک کی انتخابی سیاست اور مسلمان''، ہفت روزہ دعوت، ۱۴ دسمبر ۲۰۲۰

سے یہ الزام عائد کیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ کسی بھی طرح اکثریتی طبقہ کا ووٹ یکطرفہ ہو جائے۔ تجزیہ نگار مانتے ہیں کہ کوئی بھی پارٹی سیدھے طور پر مسلمانوں کو اپنے ساتھ جوڑنے کو تیار نہیں ہے، صرف مسلمانوں کے نام اور اس کے مسائل پر سیاسی روٹیاں سینکی جاتی ہیں۔

پچھلے سال ایک بڑی پارٹی کے سربراہ نے مسلم دانشوران کے ایک وفد سے ملاقات کی اور کہا کہ غلط فہمیاں دور ہونی چاہئیں۔ عظیم اختر نے اپنے مضمون ''مکالمے کو فروغ دینے اور غلط فہمیاں دور کرنے کے نام پر خفیہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟'' میں لکھا ہے:

> چند ماہ قبل ایک بڑی سیاسی اور مذہبی پارٹی کے سربراہ سے پانچ بڑے دانشوروں اور بیوروکریٹس کی خفیہ ملاقات بھی ایسی ہی سادھنوں کی ایک توسیعی کڑی تھی، جو ممکن ہے خفیہ ہی رہتی۔۔۔ لیکن سربراہ سے ملاقات کرنے والے مسلمانوں کے ان اعلیٰ دماغ ملاقاتیوں نے انجان مصلحتوں کے تحت یہ کہہ کر راز خود پردہ فاش کر دیا کہ انہوں نے سربراہ سے یہ ملاقات اپنی کمیونٹی کے نمائندوں کے طور پر نہیں بلکہ ملک کے ذمہ دار اور فکر مند شہریوں کے طور پر کی تھی۔[۷]

مسلمانوں کے سیاسی امور کس کروٹ بیٹھتے ہیں ابھی یہ بات پردہ راز میں ہی ہے لیکن اکثریتی طبقہ الیکشن سے قبل ایسی فضا تیار کرنا چاہتا ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں اور مسلمان فسادات کے سارے زخم بھول کر اکثریتی طبقہ کے ساتھ مین اسٹریم میں داخل ہو جائیں حالانکہ اس سے قبل برسوں میں کسی نہ کسی گروہ نے مسلمانوں کی ماب لنچنگ کی اور ان موقعوں پر اکثریتی طبقے کی طرف سے خیر خواہی کے چند الفاظ بھی نہیں نکل سکے۔

مسلم لیڈروں پر تبصرہ کرتے ہوئے عظیم اختر اپنے مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

> سابقہ حکمرانوں کے دور میں تو ہمارے قائدین ملت اور اکابرین سیاست راجیہ سبھا میں پہنچے، ایم ایل سی بنے، غیر ممالک سے دو نمبر کی شکل میں چوری چھپے آنے والے بھاری عطیات کی بدستور چشم پوشی کرنے اور سیاسی و سماجی مراعات حاصل کرنے کے لئے ہی دن کے اجالے اور رات کے اندھیروں میں خفیہ ملاقاتیں کیا کرتے تھے اور ان پر رازداری کا پردہ پڑا رہتا تھا۔[۸]

وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلم دانشوروں اور لیڈروں نے ہمیشہ صرف اپنے مفادات کو ملحوظ رکھا ہے، قوم

---

[۷] اخبار مشرق، دہلی، ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۲

[۸] اخبار مشرق، دہلی، ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۲

کی انہوں نے کوئی فکر نہیں کی ان کے سیاسی عزائم صرف دکھانے کے لئے ہوتے ہیں ورنہ وہ مسلمانوں کے سیاسی امور سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

جس قوم کے قائدین کا یہ حال ہو، اس کی زبوں حالی سے کون واقف نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی امور سے انہیں کا عام طبقہ بھی واقف نہیں ہے، انہیں ملک میں کیا کرنا چاہئے اور کن امور میں شامل ہونا چاہئے اور کن مسائل سے دور رہنا چاہئے۔ ان سے واقف ہونے کے باوجود وہ دو وقت کی روٹی کے لئے ہی بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں۔

لیکن اعلیٰ طبقات اگرچہ ان کی تعداد بہت معمولی ہے، صرف بڑے لیڈروں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ان کے ساتھ تصویریں کھنچوانے میں ہی مگن رہتے ہیں، مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ان کی طرف سے تنگ نظری یا تعصب سے انہیں کوئی سروکار نظر نہیں آتا۔

پروفیسر رؤف الرحمن خان نے اپنی کتاب ''ہندوستان کی اقلیتی آبادی: مسائل اور امکانات'' میں لکھا ہے:

> سیاسی پارٹیاں بھی الیکشن میں ایسے افراد کا انتخاب کرتی ہیں جو رشوت خور، موقع پرست، دلال ذہنیت کے ہوتے ہیں۔ ان بھیڑیوں کو مسلمانوں کا رہ نما بنا کر پیش کیا جاتا ہے، وزارتیں بھی ایسے ہی موقع پرست کیریر پولیٹیشن کو سونپی جاتی ہے جو رات دن اپنی دولت میں اضافہ اور خاندان کے مستقبل کے لئے بھاری اثاثہ جمع کرنے کے جگاڑ میں جھوٹے اور دلکش وعدوں کے جال میں عوام کو پھسانا بخوبی جانتے ہوں، ان سیاسی بازیگروں کے جھانسوں نے مسلم قوم کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے وہ کسی فرقہ پرست کی چوٹ سے زیادہ گہرا اور نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔[۹]

انہوں نے سیاسی پارٹیوں سے متعلق بھی کھل کر لکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی امور میں کس انداز میں مداخلت کرتی ہیں اور ان کا رویّہ کیسا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے فائدہ پہچانے کا سوال ہی نہیں بلکہ بکھراؤ کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے کہ مسلمان کا ووٹ منتشر رہے اور دوسری سیاسی پارٹیوں کو فائدہ پہنچے۔ ''سیاسی پارٹیوں کا رویہ'' کے تحت پروفیسر رؤف الرحمن خان نے لکھا ہے:

> ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کا رویہ مسلمانوں کے سلسلے میں ہمیشہ غیر مخلصانہ رہا ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو مختلف محاذوں پر تنقید اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ملک میں ایک

---

[۹] پروفیسر رؤف الرحمن خان، ہندوستان کی اقلیتی آبادی، مسائل وامکانات، ص ۶۳

ایسی غیر سیکولر سیاسی پارٹی ہے جو مسلمانوں کی وطن پرستی پر شک کرتی ہے۔اس کے پاس نہ تو کوئی جامع منصوبہ ہے اور نہ وسیع النظری، ہے تو بس مسلم دشمنی پر مبنی حکمت عملی، یا ایسے انتہا پسند لوگوں کی علاقائی ٹولی ہے جو مہذب سماج میں ننگا ناچ کرنے میں اپنی شان سمجھتی ہے۔ ہندوتوا کی بیساکھی پر کھڑی ایک اور بھی سیاسی پارٹی ہے جو مسلمانوں کے ہر مسئلے پر نکتہ چینی کرکے اسے فرقہ وارانہ رنگ دے ڈالتی ہے۔ یہ پارٹی ذہنی طور پر مفلوج اور تاریخی طور پر نابینا ہے، جس نے مذہب کی بے حرمتی، عبادت گاہوں کے تقدس کی پامالی، تاریخی عمارتوں اور شاہراہوں کے ناموں کی تبدیلی جیسے ہتھکنڈے اپنا کر پورے سماجی نظام کو کنفیوژن میں مبتلا کرر کھاہے۔[10]

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں بکھراؤ کی نوبت آجاتی ہے اور پھر غالب اور مغلوب کا کھیل چلتا ہے۔ ظاہر ہے اکثریتی طبقہ ہی غالب رہتا ہے، اس لئے کہ اس کی پشت پر ایک نظر نہ آنے والا ہاتھ بھی ہوتا ہے، حالانکہ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ ہاتھ کون سا ہے، یقینا یہ انتظامیہ کا وہ ہاتھ ہے جس کے بل بوتے پر اکثریتی طبقہ آگے بڑھتا ہے اور ان میں سے کچھ لفنگے قسم کے نوجوانوں کا ٹولہ آگے آکر مسلمانوں کے جان ومال کا جتنا نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، پہنچاتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی جانب سے کوئی ردّ عمل سامنے آتا ہے تو پھر انہیں اپنے جان ومال کے ناقابلِ تلافی نقصانات کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور دیگر پہلوؤں کے علاوہ ۱۹۴۷ میں پاکستان کے قیام کی سب سے بڑی ایک وجہ مسلمانوں کا یہ خوف تھا کہ اکثریتی طبقہ میں وہ محفوظ نہیں رہیں گے۔ یہ خوف بلاوجہ نہیں تھا۔ مہاتما گاندھی کے پوتے اور معروف صحافی راج موہن گاندھی کے مطابق:

۱۹۳۷ میں وزارتوں میں مسلمانوں کو منصفانہ حصہ نہ دے کر کانگریس نے اعلی ظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے حقیقت سے نگاہیں چرا رکھی تھیں۔۔۔۔۔۔ حقیقت سے منہ موڑنے کا یہ رویہ ۱۹۸۰ میں بھی موجود تھا۔ کانگریس میں موجود بہت سے اکثریتی طبقہ کو ایک شخص ایک ووٹ سے متعلق مسلمانوں کے خوف کا علم نہیں تھا۔ ہندوستانی انداز بیان کے بجائے ہندو اصطلاحات کے استعمال نے علاحدگی پسندی کے رجحان کو تقویت پہنچائی۔[11]

---

[10] ماخذ سابق، ص ۶۴

[11] محمد غزالی، کانگریس، بی جے پی اور مسلمان: ایک تاریخی پس منظر، اردو مونیٹر
https://www.urdumediamonitor.com/2016/02/29/%DA%A9%D8%A7%D9%86%DA%AF%D8%B1%DB%8C%D8%B3%D8%8C-%D8%A8%DB%8C-

کانگریس میں موجود ہندو قومیت کے جارحانہ رویے اور عناصر کے تئیں راج موہن گاندھی نے تھوڑی سی نرمی دکھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد علی جناح کے اس جارحیت کو محسوس کرنے سے پہلے ۱۹۲۴ میں دوسرے محمد علی (جوہر) نے اس چیز کو بھانپ لیا تھا۔ مولانا ماجد دریابادی کے بقول:

ہندو مسلم فسادات کو کوئی ۱۹۲۱ اور ۱۹۲۲ میں جانتا بھی نہ تھا۔ ۱۹۲۴ میں اس کی وباء پوری طرح پھوٹ چکی تھی اور جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے، اب اس کے بالکل برعکس تھی۔ بات بات پر بدگمانی اور بے اعتمادی۔ اب سب کو گاندھی جی کے چھوٹنے کا انتظار تھا کہ دیکھئے مہاتما جی آکر اس زہر کا کیا تریاق پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی مارچ ۱۹۲۴ میں ب بالآخر چھوٹے اور آخر مئی میں ان کا مفصل بیان ہندو مسلم اتحاد پر ینگ انڈیا میں نکلا۔۔۔ سب کو اس کا شدید انتظار و اشتیاق تھا۔ مولانا اس قوقت لکھنؤ میں تھے، فرنگی محل میں مقیم، وہیں پرچہ منگا کر پڑھا۔ مگر پڑھ کر زیادہ خوش نہیں ہوئے البتہ گاندھی جی کے بعض ہندو مشیروں اور مقربانِ خاص پر مولانا بہت بگڑے۔[۱۲]

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے کانگریس پر اندھا یقین کیا۔ ان کے نزدیک کانگریس کا سیکولرزم اور تعددیت پر اس کا فلسفہ ان کی بقاء کا واحد راستہ تھا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک کانگریس ایک ہندو پارٹی تھی۔ نہرو اور چند مسلمانوں کے علاوہ اس کے اکثر قائدین مسلمانوں کی ہر جائز بات کی مخالفت کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار پر ۱۹۵۱ء میں پہلا حملہ پنڈت جواہر لال کی وزارت عظمی، مولانا آزاد کی وزارت تعلیم اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلر شپ کے دوران ہوا۔ اکیلا یہ واقعہ ہی اس وقت کے ہندتوادیوں پر یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ ایک مسلمان وزیر محض ایک مہرہ ہوتا ہے جس کے پاس اختیارات کچھ نہیں ہوتے۔

نہرو جی کی موت کے صرف ایک سال بعد ان کی دختر اندرا گاندھی وزارت عظمیٰ کی گدّی پر براجمان

---

%D8%AC%DB%92-%D9%BE%DB%8C-%D8%A7%D9%88%D8%B1-%D9%85%D8%B3%D9%84%D9%85%D8%A7%D9%86-%D8%A7%DB%8C%DA%A9-%D8%AA%D8%A7%D8%B1%DB%8C%D8%AE%DB%8C

[۱۲]: عبدالماجد دریابادی، محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد، ۱۹۴۳، ص ۳۹
https://www.urdumediamonitor.com/2016/02/29/%DA%A9%D8%A7%D9%86%DA%AF%D8%B1%DB%8C%D8%B3%D8%8C-%D8%A8%DB%8C-%D8%AC%DB%92-%D9%BE%DB%8C-%D8%A7%D9%88%D8%B1-%D9%85%D8%B3%D9%84%D9%85%D8%A7%D9%86-%D8%A7%DB%8C%DA%A9-%D8%AA%D8%A7%D8%B1%DB%8C%D8%AE%DB%8C

ہو گئیں۔انہوں نے بھی خود کو لبرل اور سیکولر کے طور پر پیش کیا مگر مذہب کو استعمال کرنے میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ پنجاب میں بھنڈرا والا کو کھڑا کر کے صوبے میں آگ انہی کے دور میں لگائی گئی۔[۱۳]

کشمیر میں مستقل دخل اندازی کرنا اور منصفانہ انتخابات میں رخنے پیدا کر کے علاحدگی پسندوں کو تقویت دینے کا الزام بھی انہی پر ہے۔ اپنے آٹھ سالہ دور اقتدار میں انہوں نے مذہب اور سیکولرزم دونوں کو یکساں طور پر استعمال کیا۔ان کے بدنام زمانہ ایمر جنسی کے دوران مسلمانوں کو سب سے زیادہ مصائب برداشت کرنا پڑے۔لندن میں مقیم دائیں بازو کے معروف مصنف طارق علی کے مطابق:

صفائی کے نام پر پراپر ٹی اسپیکولیٹرز (پراپرٹی مافیا) کیلئے جامع مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کے گھروں کو مسمار کئے جانے نے ایمر جنسی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ صدر مملکت فخر الدین علی احمد نے سنجے سے صبر کی درخواست کی۔ مسلمانوں کی جانب سے کشمیر کے قدآور سیاست داں شیخ عبداللہ نے مسز گاندھی سے مداخلت کرنے اور اس ذلت کو روکنے کی درخواست کی مگر انہیں نظر انداز کر دیا گیا...دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے نائب چیئرمین جگ موہن نے ایک وفد کو یہ کہہ کر ذلیل کیا تو تم دہلی کے دل میں ایک چھوٹا پاکستان بنانا چاہتے ہوں۔[۱۴]

تقریباً ہر انتخاب کے وقت اندرا گاندھی نے مسلمانوں سے مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرنے، اردو کو اس کی حیثیت دینے اور مسلمانوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرنے کا وعدہ کیا مگر اقتدار میں آنے کے بعد ایک وعدہ بھی وفا نہ ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ اکثریتی طبقہ کو یہ تاثر دیا جاتا رہا ہے کہ مسلمان کو ان کے حقوق دینے کا مطلب اکثریتی طبقہ کے حقوق چھین کر مسلمانوں کی منہ بھرائی ہوگا۔مارک ٹیلی کے بقول: حقیقت یہ ہے کہ اپنے اقتدار کے آخری دور میں مسز گاندھی نے اکثریتی طبقہ کو ایک مضبوط ووٹ بلاک میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس نئی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پورا ہندوستان اکثریتی طبقے کی احیاء پرستی کی زد میں ہے۔[۱۵]

۱۹۷۸ میں مرارجی ڈیسائی کے زیر قیادت جنتا پارٹی حکومت نے اقلیتی کمیشن قائم کیا۔ دو سال بعد

---

[۱۳] محمد غزالی، کانگریس، بی جے پی اور مسلمان: ایک تاریخی پس منظر، اردو مونیٹر

[۱۴] ماخذ سابق

[۱۵] ماخذ سابق

مسلمانوں کے حالات کے مطالعے کیلئے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔۱۹۸۳ میں مسز گاندھی نے ایک پروگرام متعارف کیا جس کے تحت مسلمانوں کے لئے روزگار اور قرضوں کے حصول میں آسانیاں پیدا کرنے کا وعدہ کیا گیا۔اس کے بعد کیا ہوا؟ گوپال سنگھ کمیشن رپورٹ کی سفارشات کو دبا دیا گیا جسے وی پی سنگھ نے شائع کیا۔انڈیا ٹوڈے (۳۱ جنوری ۱۹۹۱) کے مطابق اس طرح مسلمانوں میں پروپیگنڈے کا بہترین مواد فراہم ہوگیا۔ بہرحال منموہن سنگھ کی سرکار میں سچر کمیٹی کے ذریعہ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی صورتحال پر تفصیلی مطالعہ کروا کر شائع کر کے کچھ تو معاملے کو آگے بڑھایا گیا مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کانگریس دور حکومت میں بہت سے مسلمان وزیر بنائے گئے مگر کچھ رائے ایسی بھی ہے کہ آزادی سے لے کر آج تک رفیع احمد قدوائی کے علاوہ یہ لوگ ملّت کے کسی کام کے نہ تھے۔اگر مسلمانوں کو وزارت دینا ہی کوئی بہت بڑا احسان ہے تو یہ کام دوسری پارٹیوں نے بھی کیا جیسے کہ بی جے پی۔ان سے توقع یہ کی جاتی ہے، جس پر وہ پورا اترتے ہیں، کہ ظلم و ناانصافی کے خلاف زبان تک نہیں ہلائیں گے۔ایک مسلم وزیر کتنا بے بس اور لاچار ہو سکتا ہے اس کی عکاسی ڈاکٹر ذاکر حسین کے نواسے اور بابری مسجد شہادت کے وقت وزیر تجارت سلمان خورشید کے اس مضمون سے ہوتی ہے جو انہوں نے سنڈے میگزین میں ۷ دسمبر ۱۹۹۲ کو لکھا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں: ”مجھ سے مسلسل کہا جارہا ہے کہ بحیثیت مسلمان میں اس توڑ پھوڑ اور تباہی کا جواب دوں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔یہ مطالبہ ہمدردوں اور مخالفین دونوں کی جانب سے کیا جارہا ہے۔ مسلمان وزرا خاموش کیوں ہیں؟ مسلمان وزرا اپنی کرسیاں کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟...شاہ بانو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مسئلہ پر وہ مسلمان وزرا اور ارکان پارلیمنٹ کے بولنے کے حق پر معترض تھے۔اس وقت ان سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ وہ اس لئے استعفیٰ دیں کیوں کہ وہ بولے تھے۔آج ان سے اس لئے استعفوں کے لئے کہا جارہا ہے کیوں وہ بولے نہیں!“ بین السطور میں پڑھنے کی کوشش کیجئے: مسلمان صرف اپنے وجود اور ملک کو تباہ کرنے کے لئے بولے۔جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے سلمان خورشید سے ہر کوئی اتفاق کرے گا مگر آخر کے جملے میں جو دفاع انہوں نے پیش کرنے کی کوشش کی وہ نہایت کمزور اور مضحکہ خیز ہے۔ گجرات ۲۰۰۲ء اور مظفر نگر ۲۰۱۳ء سے پہلے تمام بھیانک فسادات کانگریس کے دور حکومت میں ہوئے ہیں جن میں پولس نے لرزہ خیز مظالم برپا کئے مگر کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں جس میں کسی مسلم وزیر یا ممبر پارلیمنٹ نے ان مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کی ہو یا ان

جرائم میں ملوث کسی ایک افسر کو کوئی سزا دی گئی ہو۔

مسلم سیاست نے کم و بیش دو رخ اختیار کر لئے جو آزادی سے پہلے تھے۔ ایک طرف وہ سیاست داں یا سیاسی مسائل پر لکھنے اور بولنے والے لوگ ہیں جو سیکولر خیمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سیاست داں، سیکولر سیاسی پارٹیوں میں رہ کر ملت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ او قاف، جان و مال کا تحفظ، اردو زبان، عبادت گاہوں اور قبرستانوں کا تحفظ، شادی خانے، حج ہاؤس اور اردو ہالوں کی تعمیر وغیرہ جیسے امور پر بول کر اپنی سیاسی جماعتوں کی پالیسی کے دائرے میں مسلم مفادات کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سیاسی جماعتیں بھی ان ہی دکھاوے کے اعلانات تک ان مسلم رہنماؤں کو محدود رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حکومت میں مسلمانوں کے نمائندے نہیں بلکہ مسلمانوں میں حکومت کے نمائندے ہیں۔ حکومت ملنے پر ان مسلم رہنماؤں میں سے کسی کو او قاف یا اقلیتی امور کی وزارتیں مل جاتی ہیں۔ سچر کمیٹی کے بعد ادھر حالیہ برسوں میں تعلیمی، معاشی ترقی کی کچھ نمائشی سرگرمیاں بھی شروع ہوئی ہیں۔ کوئی بڑا نیتا مسلمانوں کی کسی محفل میں جائے تو اس کی گفتگو بھی عام طور پر انہیں امور تک محدود ہوتی ہے اس طرز نے مسلم سیاست کو چند مسائل تک محدود کر دیا ہے۔ ملک کی پالیسی کے وسیع تر مباحث سے مسلمانوں کو بے تعلق کر دیا ہے اور اس تاثر کو تقویت پہنچائی ہے کہ مسلمانوں کو ملک کے عام انسانوں سے یا ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسی کو بی جے پی ووٹ بنک پالیٹکس یا مسلم اپیزمنٹ یا سیڈو سیکولرزم کہتی ہے۔ عام ہندوؤں میں مسلمانوں کے تئیں اجنبیت اور بے اعتنائی کے فروغ میں اس پالیسی کا بھی کلیدی کردار ہے۔

سیکولر سیاست ہی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ کچھ مسلمان بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ مل کر فاشزم کی مخالفت کی سیاست میں مصروف ہیں۔ ان میں لیفٹ جماعتوں کے باقاعدہ ارکان کے علاوہ ایسے دین دار لوگ بھی ہیں جو باقاعدہ لیفٹ سیاست کا حصہ تو نہیں ہیں لیکن فرقہ پرستوں کی مخالفت اور ان کے اقدامات کے خلاف احتجاج میں وہی زبان اور لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں جو ان مفکرین کے یہاں ملتا ہے۔ حالیہ دنوں میں دلتوں کی ''مول نواسی'' سیاست نے بھی بعض حلقوں میں فروغ پائی ہے۔ یہ لوگ ذات پات کی سوشل انجینئرنگ میں مسلمانوں کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری طرف چھوٹی، بڑی مسلم پارٹیاں ہیں۔ یہ پارٹیاں مسلمانوں کا نام لے کر ان کے حوالے سے اور ان کے مسائل کی نمائندگی کے دعوے کے ساتھ سیاست کرتی ہیں یا جدید اصطلاح میں ''شناخت'' کی سیاست کرتی ہیں۔ شناخت کی سیاست کے کئی پہلو ہیں لیکن ہمارے ملک میں اس سیاست کا جو طرز

سامنے آتا ہے وہ زیادہ تر ردّ عمل کی سیاست ہوتی ہے۔جذباتی نعرے، اشتعال انگیز بیانات، خودساختہ دشمنوں کے خلاف غیظ وغضب اور نفرت کا ہیجانی اظہار، اس ملک میں ہیرو اور لیڈر بننے کا شارٹ کٹ راستہ ہے۔ یہ لیڈر بھی قرآن وسنت کی بات کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے ''خیر امت'' وغیرہ کی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن عملاً مسلمانوں کو محض ایک نسلی گروہ سمجھتے ہیں اور دیگر ذاتوں یا نسلی گروہوں کی طرح ان کی سیاسی دلچسپی کو صرف ان کے تحفظ وترقی کے مسائل تک محدود کر دیتے ہیں۔

یہ سیاست کوئی نئی سیاست نہیں ہے۔آزادی کے بہت پہلے سے مختلف مرحلوں میں یہ سیاست مختلف شکلوں میں سامنے آتی رہی ہے۔ہر مرحلے میں مسلمانوں کو اس سے شدید نقصان پہنچا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہر آزمائشی مرحلے میں مسلمانوں کی نئی نسلیں اسی دھوکے کی شکار ہو جاتی ہیں۔

''شناختی'' (آئیڈنٹی ٹی) پالیٹکس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آئیڈنٹی ٹی کا سوال بہت پیچیدہ ہے۔ یہاں ہر فرد کے ساتھ متعدد شناختیں وابستہ ہیں۔ دلت پالیٹکس ذات پات کی کشمکش بن گئی تو سنگھ پریوار نے دلتوں کی متعدد ذیلی ذاتوں کو اور ان کی شناختوں کو ابھارا اور ان کے درمیان سوشل انجینئرنگ کے ذریعے جگہ پیدا کرلی۔ یہی کام اب مسلمانوں میں ہو رہا ہے۔

سیاست کے یہ دونوں طرز یعنی سیکولر جماعتوں میں شمولیت اور شناخت کی سیاست، بظاہر ایک دوسرے سے متضاد ہیں لیکن دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کہ مسلمان عام سماج سے الگ تھلگ ایک ایسا گروہ بن جاتے ہیں جن کی دل چسپیاں صرف اپنے فرقے تک محدود ہیں بلکہ اپنے فرقے کے بھی چند گنے چنے مسائل تک محدود ہیں۔ دونوں طرز ہائے سیاست اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین اور اخلاقی تصورات کے مطابق باقی اہل وطن کے لئے کسی تعمیری ایجنڈے کے نمائندہ بن سکیں۔ 'ووٹ بنک' اور 'سوڈو سیکولرزم' کی جن اصطلاحات پر دائیں بازوں کے عناصر نے پورا ایک ڈسکورس کھڑا کیا ہے، ان کی بارآوری کا میدان یہی صورتحال ہے۔اب یہ بات متعدد مطالعات سے ثابت ہو چکی ہے کہ ہندتوا کی قوتوں نے اپنے عروج کے لئے، مسلمانوں کی اس تصویر کا بہت کامیابی سے استحصال کیا ہے۔

یہ سوال کہ کیا مسلمان ایک پولیٹکل کمیونٹی ہیں، اس پر ماہرین سیاسیات کے درمیان کافی عرصے سے بحث چل رہی ہے کہ کیا مسلمان ایک پولیٹکل کمیونٹی ہیں؟ پہلے پولیٹیکل کمیونٹی کی اصطلاح کسی قومی ریاست کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی، لیکن اب علم سیاسیات میں یہ اصطلاح ان افراد کے گروہ

کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جن کے سیاسی مقاصد، قدریں اور مفادات مشترک ہوں۔[۱۶]

ہندوستان کے دلتوں اور اقلیتوں کے بہت سے ایسے مسائل ہیں، جو قابل توجہ ہیں، مگر کچھ طاقتور عناصر بڑی مہارت سے کہیں کی باتوں کو کہیں سے جوڑ کر اصل باتوں سے توجہ ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تقریباً تمام تر ذرائع ابلاغ پر ایسے ہی گروپ کا کنٹرول ہے۔ انتخابات کے موقع پر کچھ باتوں کا چرچا ہوتا ضرور ہے لیکن بات کسی نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے، اور پھر نئے موضوعات سامنے لے آئے جاتے ہیں۔ نئے نئے موضوعات کو نئے نظریے سے دیکھا جاتا ہے اور نتیجہ عام طور پر صفر ہی رہتا ہے۔ بلکہ اس کے نتیجے میں محرومی کے حوالے سے ایس سی، ایس ٹی (دلتوں، آدی واسیوں) اور مسلمانوں کے مشترک مسائل میں بھی اتحاد قائم نہیں ہو پاتا ہے۔

آزادی کے بعد سے اس سلسلے میں کئی کوششیں کی جا چکی ہیں لیکن ابھی تک واضح طور سے یہ طے نہیں کیا گیا ہے کہ ذات کے برہمن اور برہمن واد میں فرق کر کے کس طرح کام کیا جائے۔ بہت سے برہمن سماجی اونچ نیچ اور ذات پات کے خلاف ہر طرح کی جدوجہد کرتے رہے ہیں، اور آج بھی ایسے افراد کی کمی نہیں ہے۔ اور بہت سے وہ لوگ جو عزت و ذلت پر مبنی طبقاتی نظام کے کٹر مخالف بنے ہوئے ہیں۔ ایسا برہمن واد کسی نہ کسی درجے اور شکل میں تھوڑے فرق کے ساتھ مسلم سماج میں بھی پایا جاتا ہے۔ بہت سے اشراف سمجھے جانے والوں نے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی ایسی روش و رویہ اختیار کر لیا جس سے سماجی اونچ نیچ میں کمی آنے کی راہ مسدود ہو کر رہ گئی۔ ایسی صورتحال میں اس سوال پر سوچنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کمی کہاں رہ گئی ہے۔ اس کو دور کئے بغیر بہتر تبدیلی کا راستہ ہموار نہیں ہو سکتا ہے۔ کچھ افراد کے ممبران پارلیمنٹ، یا ممبران اسمبلی بن جانے سے بات نہیں بن سکتی ہے۔ اصل مسئلہ ذہنی و سماجی سطح پر ایسی ذہنی و بنیادی تبدیلی کا ہے، جس سے طبقاتی سطح پر ذہنی و سماجی تبدیلی پیدا ہو کر وقار کے ساتھ، زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کی لہر چل پڑے۔ پس ماندہ، محنت کش مسلم برادریوں و طبقات کے تعلق سے راست طور سے زیادہ قابل توجہ معاملہ ہے۔ ان کے لئے مسلم کمیونٹی سے وابستہ ہونے کے سبب کئی قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات ہیں۔ اس کی واضح مثال آئین کی دفعہ ۳۴۱ کے مد نظر صدارتی آرڈیننس سے ایک ہی طرح کے پیشے سے جڑے ہونے کے باوجود ہندو مسلم محنت کشوں کے درمیان مذہب کی بنیاد پر امتیاز و تفریق ہے۔ سیاسی طور پر یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے۔ دلتوں اور ایس سی، ایس

---

[۱۶] سید سعادت اللہ حسینی، ہندوتوا اور مسلم سیاست، زندگی نو، اکتوبر ۲۰۲۱

ٹی کی ترقی اور مختلف شعبہ حیات میں نمائندگی کے لئے شروع کی جانے والی تحریکوں کے سربراہوں کی طرف سے ایسی موثر آواز اٹھائی گئی ہے جو دفعہ ۳۴۱ میں ضروری ترمیم کر کے تمام ہم پیشہ طبقات کے لئے ملک کے وسائل حیات سے استفادے کے راستے یکساں اور مساوی طور سے ہموار ہو جائیں کیونکہ سارے کے سارے محرومی میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ شریک ہیں۔

ہر زمانے میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے اور ایسے نئے نئے مسائل سامنے آتے چلے گئے کہ دلتوں کے ساتھ اتحاد واشتراک کی بات کچھ پیچھے چھوٹ گئی۔ اسکی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ نہ تو مسلم سماج میں دانشور طبقات کی سوچ رکھنے والوں کی موثر تعداد ہے، نہ ہی دلت قیادت کی طرف سے ضروری حد تک، ایثار کے ساتھ مسلمانوں سے اتحاد کی بنیادوں کو جاننے اور سمجھنے کی نتیجہ خیز کوششوں پر صحیح توجہ دی گئی ہے۔ اس کے باوجود غیر متوازن قائم شدہ نظام اور سسٹم میں منصفانہ معتدل تبدیلی کے لئے تو کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر موجودہ صورتحال کو بدلنا ایک مشکل امر ہے۔

تاریخ کی کچھ پرانی باتوں کو پکڑ کر رونے سے ظاہر ہے کہ انقلاب نہیں آیا کرتا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے مسلم لیگ نظریہ تقسیم وطن اور اسلام کے بجائے بودھ مت قبول کرنے کا جو پس منظر ہے، اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ جس وقت انہوں نے دلتوں کے ساتھ بودھ مت قبول کیا تھا، اس وقت آس پاس خارجی و داخلی طور سے موثر رول ادا کرنے والا کوئی مسلم ملک نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ خدا، آخرت وغیرہ کا اقرار کئے بغیر زندگی کا ایک مخصوص تصور ڈاکٹر امبیڈکر کو بودھ مت میں نظر آیا، اس لئے اسے قبول کرنے میں خارجی اور داخلی سطح پر انہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ بڑا محرک اکثریتی سماج کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ گاندھی جی کا اصرار تھا کہ وہ کسی "غیر ملکی مذہب" کے بجائے ہندوستان میں پروان چڑھنے والے دھرموں میں سے کسی دھرم کو قبول کریں۔

دنیا میں تقریباً ۱۸۱ خود مختار آزاد ملک ہیں۔ ان میں سے ۱۶۰ ملکوں میں مسلم آبادیاں ہیں۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد ان مسلم آبادیوں کی تعداد سے بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی مسلم آبادی سے بھی بڑھ کر ہے۔ عبرت کا مقام یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو ان کے ہی ملک میں مسلم قیادت کی کمزوری کی وجہ سے فرقہ پرست اور غیر ملکی سمجھنے اور کہنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اگر رام ولاس پاسوان دلتوں کی بات اٹھاتے ہیں تو انہیں فرقہ پرست نہیں کہا جاتا تھا، چودھری چرن سنگھ جاٹ فرقہ کی باتیں کیا کرتے تھے تو وہ فرقہ پرست نہیں تھے۔ لیکن اگر مسلمانوں کے حق میں کوئی مسلم لیڈر تمام سیاسی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر کر آواز اٹھاتا ہے تو اسے فرقہ پرست کہا جاتا ہے۔ بیشتر ممبران پارلیمنٹ اور اسمبلی نے بقول

مشہور صحافی ایم جے اکبر:

اپنے ہونٹ سی لئے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہر قسم کے جذبات سے عاری دکھائی دیتی ہیں، لیکن بھاری تنخواہ جس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوتا کی بے پایاں مسرت ان کے چہرے سے عیاں ہے۔ ان کے دن بھر کے تقسیم اوقات میں دوپہر کے پر تکلف کھانے کا وقفہ، اعلی قسم کی شراب یا پھلوں کے رس سے لطف اندوز ہونے کا وقفہ اور قرینہ سے سجی ہوئی میز پر رات کے کھانے کا وقفہ شامل ہے، جس میں کبھی کبھی کاروباری مسائل کا وقفہ بھی دخل در معقولات کے طور پر حائل ہو جاتا ہے۔ ان کے انداز گفتگو اور لب ولہجہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے گویا وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہیں۔ یہ بنی نوع انسان کی وہ جدید ترین نسل ہے جس پر تقدیر کی دیوی نے پوری دنیا کی ساری خوشیاں نچھاور کر دی ہیں۔[17]

شاید یہی احساس تھا کہ چند مسلم رہنماؤں نے مل کر کلکتہ میں یکم فروری ۱۹۹۵ کو ایک عظیم مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ اس مسلم کانفرنس کے سلسلے میں مغربی بنگال کے سب سے بڑے بنگلہ اخبار ''آنند بازار پتریکا'' کا کہنا تھا:

کلکتہ کانفرنس میں جن لیڈروں یا مقامی رہنماؤں نے حصہ لیا وہ سبھی کٹر غیر فرقہ پرست یا سیاسی فائدہ لوٹنے والے نہیں ہیں، یہ دعوی پیش کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجموعی طور پر مسلم فرقے کی ترقی کے لئے جو قرار دادیں منظور کی گئی ہیں اور ان ترقیاتی سمتوں کو متعین کرنے کے لئے جو مرکزی قیادت تیار ہوئی ہے ان کے ارادے اور چہرے کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے تعلیم اور ملازمت میں ریزرویشن کا جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ ناقابل قبول ہے۔[18]

مذکورہ کانفرنس کے سلسلہ میں کلکتہ سے ہی شائع ہونے والا ایک دوسرا اخبار دی اسٹیٹس مین اپنے ۴ فروری ۱۹۹۵ کے اداریے میں لکھتا ہے:

مسلمانوں کے لیڈر خاص کر وہ لوگ جو مسلمانوں کی طرف سے بولنا اپنا حق سمجھتے ہیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ مسلمان جو اپنی علاحدہ شناخت قائم رکھنا چاہتے ہیں کس طرح یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی کے سامنے کوئی واضح خیال نہیں ہے کہ انڈین اسٹیٹ اپنے ہر شہری سے جس

---

[17] انوار عالم ایڈووکیٹ، ان سنی آوازیں، غازی ملت پبلی کیشنز، کلکتہ، ص ۲۶۔۲۷

[18] ماخذ سابق، ص ۲۷۔۲۸

بات کا تقاضہ کرتی ہے اس کی روشنی میں اس شناخت کو کس طرح قائم رکھا جائے۔[۱۹]

مسلم قیادت کے سیاق و سباق میں کلکتہ سے ہی شائع ہونے والے ایک اردو روزنامہ "آزاد ہند" اپنے اداریے میں لکھتا ہے :

دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے ملک بھر سے آئے ہوئے اے۔آئی۔سی۔سی کے مسلم ممبروں میں اس وقت زبردست مایوسی، بددلی اور بیزاری پھیل گئی جب انہوں نے دیکھا کہ اجتماع کے جم غفیر میں انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں کہ وہ کس کھیت کی مولی ہیں۔ اور نقار خانہ میں جہاں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی مسلمانوں کی آواز مثل طوطی تھی۔ یہ آواز بھی مسلم کانگریسی مندوبین کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ان بیچاروں کو کسی نے لب کشائی کی زحمت نہیں دی۔ خاموش تماشائی بنے کانگریس کا کارنیول دیکھتے رہے۔ دل بھر آیا تو دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے (اس وقت کے) ریلوے وزیر سی کے جعفر شریف صاحب کے گھر پر یہ مسلم کانگریسی لیڈران جمع ہوگئے اور اپناد کھڑا رویا۔ پھر یہ جتھہ (اس وقت کے) وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے در دولت پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ راوی کہتا ہے کہ ۹۰ منٹ تک مسلم کانگریسی لیڈر اپنا قصہ درد سناتے رہے اور وزیر اعظم صاحب ساکت و جامد صرف سنتے رہے۔ آخر میں صرف اتنا بولے کہ "آپ لوگوں کی باتوں پر میں غور کروں گا۔

اس سے قبل مسز اندرا گاندھی کے زمانے میں بھی جب جب مسلمانوں پر بہت مار پڑتی تو مسلم ممبران پارلیمنٹ تڑپ اٹھتے تھے۔ اور کسی جگہ بیٹھ کر رو دھو لیتے تھے۔ ایک مرتبہ میرٹھ کے فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو مولانا اسعد مدنی (اس وقت کے) ممبر راجیہ سبھا کے بنگلے پر ڈنر میں مسلم ممبران پارلیمنٹ کثیر تعداد میں (سوائے لفٹ پارٹیوں کے) جمع ہوگئے۔ اس محفل میں طے پایا کے مسلم ممبران پارلیمنٹ میمورنڈم لے کر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے پاس جائیں گے۔ اور انہیں الٹی میٹم دیں گے کہ اگر فلاں تاریخ تک میرٹھ کے مظلوموں کی داد رسی نہ کی گئی اور دیگر مطالبات منظور نہ ہوئے تو مسلم ممبران پارلیمنٹ احتجاجا بائیکاٹ کریں گے اور اجلاس میں بیٹھنا بند کر دیں گے۔ مسز گاندھی نے مسلم ممبران سے ملاقات کی اور دریافت کیا کہ اگر آپ کے مطالبات پورے نہیں ہوئے تو کیا کریں گے؟ جواب دیا ہم خاموشی سے واپس چلے جائیں گے اور آپ کے آنچل کے سائے میں زندگی کے باقی دن گزار دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

---

[۱۹] ماخذ سابق ص ۲۸

مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا نہ کسی نے پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کیا نہ حق تلفی اور ظلم کا مقابلہ کیا۔ مسلم مزاج 'نشستند، گفتند اور برخاستند' کا نمونہ بن کر رہ گیا ہے۔[۲۰]

ملک کے مسلم رہنماؤں میں اپنی اپنی پارٹی کی بے رخی، سرد مہری اور ظلم و زیادتی کے خلاف بے چینی اور بیزاری پیدا ہوئی ہے یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے اکثر ایسا ہوا ہے اور نتیجہ صفر رہا ہے۔ مسلمان سیاست دانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہو کر سب سے پہلے وہ اپنی ملت سے کٹ جاتے ہیں یا ان کا بہت کمزور سا تعلق باقی رہتا ہے۔ مسلم سیاسی لیڈر کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی جماعت کا تو وفادار ہے مگر اپنی ملت کا نہیں۔ جماعت اس کے لئے سب کچھ ہے، ملت کچھ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوام اپنے رہنماؤں سے بد ظن ہو گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی صورت میں ان پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اسد الدین اویسی کے جلسوں میں بھیڑ خوب رہتی ہے لیکن انہیں کسی بھی جگہ اتنے ووٹ نہیں مل پاتے ہیں کہ ان کی پارٹی آگے بڑھ سکے۔ علاقائی مسلم لیڈر شپ ایسی تقسیم ہو چکی ہے کہ کوئی بہوجن سماج پارٹی کے ساتھ ہے، کوئی سماج وادی پارٹی کے ساتھ، کوئی کانگریس کے ساتھ تو کوئی بھارتی جنتا پارٹی کے ساتھ اور کوئی جنتا دل اور لوک دل جیسی پارٹیوں میں اپنی جگہ تلاش کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم اقلیت ہر جگہ بے آبرو نظر آتی ہے۔ اس کی سیاسی امور میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو کام تھے وہ بھی تقسیم ہو گئے ہیں اور موجودہ دہائی میں ان میں غربت تیزی سے بڑھی ہے۔

آزادی کے بعد سے حکومتوں نے مسلمانوں کے حقوق کو کس طرح پامال کیا ہے یہ سبھی کے سامنے ہے۔ آج پورے اتر پردیش میں کچھ پرائیوٹ مدارس اور اردو میڈیم اسکول قائم و باقی ہیں جن کے ذریعہ مسلمان بچوں کو دینیات و قرآن کی تعلیم دے کر ان کے مذہبی تشخص کو باقی رکھنے کی ایک کمزور سی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ آج مسلمانوں کے بچے اور بچیاں اپنے والدین، رشتے داروں یا دوستوں کو نہ صرف یہ کہ خطوط ہندی میں لکھتے ہیں بلکہ وہ ہندی زبان کے اخبارات کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ آج کی موجودہ نوجوان نسل کے لئے اردو زبان ایک 'غیر ملکی زبان' کی طرح ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور قائم کردہ اداروں کو اقلیتی ادارہ ماننے کی راہ

---

[۲۰] انوار عالم ایڈووکیٹ، ان سنی آوازیں، غازی ملت پبلی کیشنز، کلکتہ، ص۔ ۲۹۔ ۳۰

میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہی ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کو ایک آرڈی نینس کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا تھا حالانکہ نیشنل کمیشن فار مائنارٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز کے اس وقت کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے اس کے اقلیتی کردار کو بحال کر دیا تھا۔ اس فیصلہ کے خلاف کئی تنظیمیں عدالت میں بھی جا چکی ہیں اور مقدمات عدالت میں ہیں۔ دوسری مثال صوبہ مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں ملی الامین کالج کو اس کے اقلیتی کردار کے ساتھ الحاق دینے سے کلکتہ یونیورسٹی کا کھلے الفاظ میں انکار ہے۔ یہی نہیں بلکہ سب سے پہلی ضرب عثمانیہ یونیورسٹی پر پڑی جہاں انجینئرنگ سائنس، میڈیکل سائنس، کامرس اور آرٹس کی اعلی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی لیکن اسے حکومت نے ختم کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ میں ریاستوں کی لسانی تقسیم ہوئی تو اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش وغیرہ کو خالص ہندی ریاست قرار دے دیا گیا۔ اس لئے اتر پردیش سے اردو کو نصاب تعلیم سے خارج کر کے ہندی کو رواج دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پورے اتر پردیش میں اردو میڈیم کا کوئی سرکاری اسکول نہیں ہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے کی سازش کی گئی جس میں حکومت پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی مگر یونیورسٹی ایکٹ میں بعض ایسی ترمیمیں ضرور کر دی گئیں جن سے اس کا اقلیتی کردار مجروح ہوا ہے۔ اس ظلم وستم پر بھی جب صاحب ارباب واقتدار کا دل نہیں بھرا تو وہ مسلمانوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور قائم کردہ اداروں کو اقلیتی ادارہ ماننے کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ دینی اور عربی مدارس جو پورے اتر پردیش میں پھیلے ہوئے ہیں ان پر Minimum Wages Act اور ان درس گاہوں کے ہاسٹلوں پر Institutions Control Act لاگو کر کے ان کے تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی امور میں مداخلت کا سلسلہ نیا نہیں ہے۔ اگر ہم گزشتہ صدی پر نظر ڈالیں تو ۱۹۴۷ کے بعد یوپی میں ہندوازم کی سیاست کا زور بڑھنے لگا جس میں اس وقت کی کانگریس حکومت براہ راست ملوث نظر آئی۔ ۱۳؍ اگست ۱۹۸۰ میں مرادآباد میں عید کی نماز کے اختتام کے بعد عظیم سانحہ پیش آیا۔ عید گاہ میں ایک سازش کے تحت ناپاک جانور کے داخل ہونے پر مقتدیوں اور پولس میں تکرار ہو گئی۔ ایک سازش کے تحت باہر سے کسی نے عید گاہ میں پتھر پھینک دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عید کے دن پولس والوں نے ان نہتے نمازیوں پر وحشیانہ فائرنگ شروع کر دی، جس میں ہزاروں مسلمان زخمی اور سیکڑوں شہید ہوئے۔ ان میں معصوم بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ پورے اتر پردیش میں کانگریسی حکومت کے خلاف مسلمانوں کا احتجاج ہوا لیکن لا حاصل، حتی کہ اپوزیشن نے بھی خاموش رہنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد علی گڑھ، میرٹھ میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سلسلے میں مسلم مجلس اور مجلس مشاورت کے افراد نے

اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

موجودہ صدی میں عین انتخاب کے وقت کوئی ایک ایسا شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے ہندو ذہنیت یکجا ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ گزشتہ انتخاب میں ایک شوشہ چھوڑا گیا کہ اگر یوپی میں مسلمانوں کے قبرستان میں شب برات پر لائٹ لگائی جاتی ہے تو ہندوؤں کے لئے شمشان گھاٹ میں کیوں نہیں لائٹ لگائی جاتی ہے؟ ہندو کو الفاظ کا آب حیات مل جاتا ہے اور سارے ہندو ووٹ انکی جھولی میں چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک موقع پر کہا گیا: ''لوگ اپنے لباس سے پہچانے جاتے ہیں''۔ اشارہ صاف ظاہر تھا۔ اسی طرح بنگال میں ۲۰۲۱ کے انتخاب کے موقع پر بی جے پی کے لیڈران نے ممتا بنرجی کو ''ممتا بیگم'' کہنا شروع کر دیا تھا تاکہ ہندو ذہنیت مسلمانوں کو ممتا بنرجی سے بیزار کر دے لیکن بنگالی عوام نے بی جے پی کے الفاظ کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بی جے پی نے مسلم مورچہ کے نو ممبران کو ٹکٹ دیکر بنگال میں مسلمانوں کے ووٹ کو تقسیم کرنے کی سیاست اپنائی لیکن بنگال کے عوام نے انکی جھولی میں دو ووٹ نہ دیئے بلکہ صرف کنڈیڈیٹ نے ہی اپنا ووٹ دیا حتی کہ اسکے گھر والوں نے بھی اسے ووٹ نہ دیا۔ آسام میں یو ڈی ایف پارٹی کے سربراہ مولانا بدرالدین اجمل نے ۲۲ جون ۲۰۲۱ کو دیوبند میں میڈیا کے روبرو ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ بنگال میں وزیر اعلی ممتا بنرجی نے ایک راستہ دکھایا ہے۔ یوپی میں ون پوائنٹ پروگرام کے تحت سیکولر پارٹیوں کو متحد ہو کر بی جے پی کا صفایا کرنا چاہئے۔ انہوں نے یہ بھی پیشکش کی کہ اگر ہماری ضرورت پڑے گی تو اس کام میں ہماری پارٹی مدد کرے گی۔ یو ڈی ایف نے آسام میں کانگریس سے الحاق کر کے گزشتہ الیکشن میں انتخاب لڑا تھا اور ۱۶ سیٹیں حاصل کی ہیں۔ آسام کی سرکار پر اقلیتوں اور مدارس پر زیادتی کرنے کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں اور یو ڈی ایف ۱۶ سیٹیں حاصل کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں کر پا رہی ہے۔

آزادی کے بعد سے ہر سیاسی پارٹی مسلمانوں کو اپنا ووٹ بینک سمجھتی ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے ووٹ سے وہ جیت جاتے ہیں تو مسلمانوں کو کچھ بھی نہیں ملتا، ان کے سیاسی امور پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ پہلے یہ رویہ کانگریس کا تھا آزادی کے بعد برسوں پورے ہندوستان میں اقتدار کانگریس کا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو کیا ملا؟ ہاں۔ مراد آباد کا فساد، علی گڑھ کا فساد، میرٹھ کا فساد، بابری مسجد کا تالا کھولنا، بابری مسجد کی شہادت پھر یوپی میں ذبیحہ جانور سے بھی بدتر قتل عام...

آزادی کے بعد بی جے پی کے دور سیاست میں بابری مسجد تنازع پر رام مندر بنانے کے تاریخی فیصلے کے ساتھ اب بنارس کی گیان واپی مسجد، متھرا کی مسجد اور کئی تاریخی مسجدیں متنازع ہیں۔ یہ سب معاملے بھی عدالت میں فیصلہ کے انتظار میں ہیں۔

# اخبار علمیہ

## خلا سے لی گئی ''ممی کے چہرے'' نما تصویر کا افشا

امریکی خلابازوں کے ذریعہ ۱۲/ فروری ۲۰۲۳ء کو بین الاقوامی خلائی اسٹیشن سے چند دلچسپ تصویریں لی گئی تھیں۔ تصویر کشی کے ٦/ ماہ بعد حال ہی میں ایک تصویر عوام کے لیے پیش کی گئی۔ ناسا کے خلابازوں کی جانب سے مدار سے لی گئی تصاویر چونکا دینے والی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مصری رسومات کے مطابق ڈھانپے ہوئے کسی ممی کا چہرہ ہو جو آپ کو دیکھ رہا ہو۔ ناسا نے تصاویر تو شائع کیں لیکن تفصیلات فراہم نہیں کیں۔ صرف اس قدر معلوم ہوا ہے کہ اسے عوام کو دکھانے کا اب فیصلہ کیا گیا ہے۔ کسی وجہ سے ناسا نے تصویر کش خلاباز کا نام بھی پوشیدہ رکھا ہے۔ ممی کی لی گئی تصویر جیسے صحرا میں واقع ایک بہت بڑے معدوم آتش فشاں کے گڑھے میں ہے جس کا حجم تقریباً ایک کلومیٹر کا ہے۔ یہاں پر لاکھوں سال پہلے دیو ہیکل آتش فشاں پھٹ چکے تھے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھروں سے بچھا اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک میدان ہے۔ چونکہ یہاں بارش نہیں ہوئی ہے، اس لیے یہ ہزاروں سال سے اسی طرح موجود ہے۔ یہ میدان کسی نامعلوم وجہ سے صحرا میں تبدیل ہو گیا۔ عام طور پر انسان کا بنایا ہوا یہاں کوئی ڈھانچہ بھی نہیں ہے جس کو دیکھنے کے بعد کسی نادر شی کا پتہ چلے۔ پہلی نظر میں یہ جنوبی امریکا کے صحرائے ناز کا کا ایک دیو قامت ہیکل معلوم ہوتا ہے۔ (صحیفۃ الوطن بحرین ٦/ نومبر ۲۰۲۳ء ص۱٦)

## کولنز ڈکشنری نے AI کو سال کا بہترین لفظ قرار دیا

آرٹی فیشیل انٹیلیجنس (AI) مصنوعی ذہانت کے مخفف کو ۲۰۲۳ کے لیے کولنز ورڈ آف دی ایئر کا نام دیا گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق اس اصطلاح کے استعمال میں تیزی آئی ہے اور یہ ۲۰۲۳ کی بڑی توجہ کا مرکز اور غالب گفتگو کا حصہ بن گئی ہے۔ یہ اب ای میل یا کسی اور مستقبل کی روزمرہ ٹیکنالوجی کی طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گئی ہے۔ کولنز کے مینیجنگ ڈائریکٹر نے کہا کہ الفاظ سازوں نے دنیا بھر میں شائع ہونے والی ویب سائٹس، اخبارات، میگزینوں کے تحریری مواد کے ساتھ ۲۰ بلین الفاظ پر مشتمل ایک ڈیٹا بیس کولنز کارپس کے تجزیے کے بعد اس لفظ کو سال کے بہترین الفاظ کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ۳/ نومبر ۲۰۲۳ء ص۱٦) **ک، ص اصلاحی**

# وفیات

## ڈاکٹر ف۔عبدالرحیم

## جوار رحمت میں


کلیم صفات اصلاحی

رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ


مشہور عالم محقق اور متعدد زبانوں کے متبحر عالم ڈاکٹر ف، عبدالرحیم ۴ربیع الاول ۱۴۴۵ھ/۱۹ اکتوبر بروز جمعرات بعد نماز مغرب وفات پاگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔۵ربیع الاول ۱۴۴۵ھ/۲۰ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو مسجد نبوی میں جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جنت البقیع میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔اللھم اغفر لہ وارحمہ واکرم مثواہ

ڈاکٹر صاحب کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔نام سے پہلے فانیامبادی (وانمباڑی) لکھتے تھے لیکن بعد میں فانیامبادی کے مخفف ف، عبدالرحیم سے مشہور ہوئے۔ان کی پیدائش تاملناڈ کے مسلم اکثریت والے شہر وانمباڑی (ضلع ویلور) میں ۱۳محرم ۱۳۵۲ھ/۷مئی ۱۹۳۳ء کو ہوئی۔ تعلیم کا آغاز مسجد الحی سے ہوا۔ابتدائی وثانوی تک کی تعلیم محمدیہ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر انتظام چلنے والے اسکول مدرسہ اسلامیہ، شہر وانمباڑی میں حاصل کی۔ثانویہ کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی کہ عربی زبان وادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ثانویہ کے بعد مدراس یونیورسٹی سے انگریزی زبان وادب میں بی اے آنرز کیا۔۱۹۵۷ میں ایم اے کیا اور ۱۹۶۱ء میں افضل العلما کی سند حاصل کی۔۱۹۶۳ میں عربی زبان وادب میں ایم اے کیا۔عربی زبان وادب سے خصوصی شغف کے سبب عرب ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہوئی تو جمال عبدالناصر سے مراسلت کی کوشش کرکے ۱۹۶۴ کے شروع میں قاہرہ چلے گئے جہاں سے ۱۹۷۳ء میں عربی لسانیات میں ڈاکٹر ابراہیم ابوالدجا کے زیر نگرانی ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔ان کا موضوع امام ابی منصور الجوالیقی (م ۵۴۰ھ) کی مشہور تصنیف ''المعرب من الکلام الاعجمی علی حروف المعجم'' کی تحقیق تھا۔ڈاکٹر صاحب کا شمار ان علما میں ہوتا ہے جنھوں نے علم و تحقیق میں اشتغال وانہماک کے سبب تجرد کی زندگی اختیار کی۔

۱۹۶۹ء میں جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ سے منسلک ہوئے اور ۲۶ برس تک تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دی۔اس دوران غیر عربوں کو عربی پڑھانے کی ذمہ داری ان کے سر آئی۔ چنانچہ انھوں نے اس

کے لیے ایک جامع نصاب مرتب کیا اور دروس اللغۃ العربیۃ لغیر الناطقین بھا نام سے تینوں جلدوں میں کتاب تصنیف کی جو بہت مقبول و مشہور ہوئی۔ منفرد موضوع اور دلچسپ اسلوب کے لحاظ سے غالباً یہ ایسی پہلی کتاب ہے جو عرب و غیر عرب ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں اور مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ ان تینوں جلدوں کو اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، مدراس نے ۱۹۹۵ء میں پہلی بار شائع کیا۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں اس کی تینوں جلدیں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ عربی میں ان کی تصنیفات کی تعداد تقریباً ڈیڑھ درجن ہے۔ الدخیل فی اللغۃ العربیۃ الحدیثۃ ولھجاتھا، ۱۹۷۳ میں حلب سے شائع ہوئی۔ تقریباً آٹھ سو الفاظ پر مشتمل ہے۔ تحقیق "المعرب" للجوالیقی یہ ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے جو دارالقلم دمشق سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل صفحات ۶۷۸ ہیں۔ عربی، دنیا کی ایسی زبان ہے جس نے دوسری زبانوں پر اثر ڈالا اور خود بھی دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات کو قبول کیا جو بعد میں صوتی تغیرات کے ساتھ عربی کا حصہ بن گئے۔ ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ایسے دخیل لفظوں کی تحقیق و جستجو کا آغاز اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہو چکا تھا۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے مستند اور اہم کتاب جوالیقی کی المعرب ہے۔ اس میں سات سو تیس ایسے الفاظ یکجا کیے ہیں جو غیر زبانوں سے عربی میں داخل ہوئے۔ لیکن جن لوگوں نے اس سے پہلے جوالیقی کی المعرب پر تحقیق کی تھی انہوں نے اس میں لفظوں کے اصل مآخذ پر خاطر خواہ بحث نہیں کی تھی ڈاکٹر ف، عبدالرحیم صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے باقاعدہ اس کے اصل مآخذ پر بحث کی ہے۔ ان کے اس کارنامہ نے ہندوستان کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ۸۸ صفحات پر مشتمل مبسوط مقدمہ میں لفظوں کے اقسام، ان کے مآخذ اور صوتی تغیرات پر نہایت مفید بحث کی ہے۔ اس سے لغت کے موضوع پر ان کی ماہرانہ دسترس اور عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی موضوع پر ان کی دوسری کتاب القول الاصیل فیما فی العربیہ من الدخیل ہے جو مکتبۃ لینہ للنشر والتوزیع، دمنھور سے ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی۔ ہمارے پیش نظر یہی نسخہ ہے۔ اس میں پانچ سو ایسے مزید دخیل الفاظ کی تحقیق ہے جو المعرب میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ کتاب کے مطالعہ سے عربی زبان کی وسعت اور دوسری زبانوں سے اس کے اخذ و استفادہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی تالیف و ترتیب میں عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کی کتب لغت اور قدیم و جدید دونوں قسم کے مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب علم اشتقاق (فیلالوجی) سے بخوبی واقف اور دنیا کی کئی زبانوں انگریزی، فارسی،

تمل، فرانسیسی، المانی، یونانی، ترکی، عبری وغیرہ میں ماہر تھے۔اس لیے الفاظ کے تغیرات اور تبدیلیوں پر ان کی نظر تھی۔قرآن مجید اور قدیم صحف سماوی میں جن نبیوں اور ان کے ہم زمانہ اشخاص کا تذکرہ ہے۔اس پر قدما نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے انہی کتابوں کی مدد اور اپنے مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں ایک مفید اور علمی" کتاب الاعلام باصول الاعلام الواردة فی قصص الانبیاء علیهم السلام "نام سے ترتیب دی ہے۔یہ دارالقلم دمشق سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔سواء السبیل الی ما فی العربیۃ من الدخیل۔اس کتاب میں بھی چار سو ایسے الفاظ پر تحقیق کی گئی ہے جو جوالیقی کی کتاب میں نہیں ہیں۔یہ ۱۹۹۸ء میں دارالمآثر، مدینہ منورہ سے طبع ہوئی۔معجم الدخیل فی اللغۃ العربیۃ الحدیثۃ ولهجاتها، یہ سولہ سو جدید دخیل عربی الفاظ کے مجموعہ پر مشتمل لغت ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے ترتیب دیا ہے اور جو ۲۰۱۱ء میں دارالقلم دمشق سے شائع ہوا۔ایک کتاب سحر الالحاظ فی شعر الالفاظ کے نام سے تصنیف کی جو ۲۰۱۸ء میں دارالقلم سے طبع ہوئی۔المسعف فی لغۃ واعراب سورہ یوسف۔یہ کتاب طلبہ کے اصرار پر لکھی گئی سورہ یوسف کی تفسیر ہے۔اس میں بھی نحو و لغت کے مسائل زیادہ زیر بحث آئے ہیں اور طلبہ ہی اس کے مخاطب ہیں۔یہ المؤسسۃ الاسلامیۃ، مدراس سے پہلی بار ۱۹۹۳ میں شائع ہوئی۔نصوص من الحدیث النبوی الشریف، یہ کتاب سولہ احادیث نبویہ کا مجموعہ ہے۔ڈاکٹر صاحب نے عربی زبان کے مبتدی طلبہ کے لیے سہل اور عام فہم انداز میں ترتیب دی تھی۔اس کا مقصد ان طلبہ کو حدیث سے متعارف کرانا جن کی زبان عربی نہیں ہے۔اس میں قصے کہانی کے بجائے احادیث رسول کے قصص و واقعات نقل کر کے عربی سکھانے کی ایک قابل قدر کوشش کی تھی۔یہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، مدراس سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔احادیث سهلۃ۔اس میں ڈاکٹر صاحب نے چند احادیث کو جمع اور اس کی شرح کی ہے۔یہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ مدراس سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی ہے۔یہ کتاب بھی دارالمصنفین میں موجود ہے۔ان کے علاوہ الباحث عن الحق، فی بلاط هرقل، انهامن مشکوۃ واحدۃ، ابشر بخیر یوم، اربعون حدیثا لتعلیم اللغۃ العربیۃ والتربیۃ النبویۃ وغیرہ نام سے ان کی تالیفات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے انگریزی اور اردو زبانوں میں بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔انگریزی میں جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں یورپ اسپیکس عربک، آئی ایم پراؤڈ بی اے مسلم، حج، عمرہ اینڈ زیارت، سورۃ الحجرات (اس میں انگریزی زبان میں اس کے معانی کا ترجمہ و تفسیر کی گئی ہے) فرام اصفہان ٹو مدینہ ان سرچ ٹو ٹروتھ، لٹ اس بگین ٹو ریڈ عربک وغیرہ بہت مشہور ہوئیں۔اردو کتابوں میں ایک کتاب "پردہ

اٹھادوں اگرچہرۂ الفاظ سے'' کے نام سے ہے۔یہ چند الفاظ کا تاریخی مطالعہ ہے جو عام قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، چینائی مدراس سے ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آئی اور یہ بھی دارالمصنفین میں موجود ہے۔دوسری اردو کتاب ''کیا یہ کتاب دینی درس گاہوں میں پڑھانے کے قابل ہے'' کے نام سے تصنیف کی ہے۔ان کی بعض عربی کتابوں کے اردو اور دوسری زبانوں میں ترجمے بھی کیے گئے ہیں۔ان میں مفتاح دروس اللغۃ العربیۃ لغیر الناطقین بھا (۳ جلدیں) کا ترجمہ اردو، تامل اور فرانسیسی میں کیا گیا۔اس کا اردو ترجمہ یہاں کے کتب خانہ میں نہیں ہے۔معجم الدخیل فی اللغۃ العربیۃ الحدیثۃ ولھجاتھا کا فارسی میں ترجمہ دو مترجمین محمد علی سلیمانی مروست اور فاطمہ جمشیدی نے مل کر ''فرہنگ واژھای دخیل در زبان عربی معاصر ولھجہ ہای آں'' کے نام سے کیا۔

اعلیٰ علمی ولسانی خدمات کے سبب متعدد مناصب سے سرفراز بھی کیے گئے۔مدینہ یونیورسٹی میں استاد ہوئے۔مجمع الملک فہد، لطباعۃ المصحف الشریف، مدینہ منورہ کے شعبۂ مرکز الترجمات کے ڈائریکٹر بھی منتخب کیے گئے۔۱۹۹۸ء میں حکومت ہند کی طرف سے عربی زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ بھی دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو عربی زبان وادب سے عشق تھا۔اس کی توسیع واشاعت کے لیے خود کو وقف کرنے کا ایک مقصد ان کے پیش نظر ممکن ہے یہ بھی رہا ہو کہ لوگوں کے اندر قرآن و حدیث اور سیرت و مصادر اسلام سے براہ راست استفادہ کی لیاقت پیدا ہو۔ان کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے والا یہ محسوس کرے گا کہ عربی کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں میں بھی ان کو مہارت تھی۔

علامہ شبلی، دارالمصنفین اور رسالہ معارف سے ان کو خاص انس تھا ۔اپنی کتابیں ادارہ کو ضرور بھجواتے تھے۔یہاں کے مبصرین نے ان کی بعض کتابوں پر تبصرے بھی کیے ہیں۔ادارہ کی مطبوعات اور رسالہ معارف خاص طور سے ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔اس کا اندازہ معارف میں شائع شدہ لسانیات سے متعلق بعض مضامین پر ان کے ناقدانہ استدراک سے ہوتا ہے۔

معارف جون ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں گوردیال سنگھ مجذوب کا ایک مضمون ''بائبل میں قدیم ہندوستانی ثقافت کے اثرات'' کے عنوان سے چھپا۔اس میں مضمون نگار نے اپنے نظریہ کے اثبات کے لیے بعض زبانوں میں صوتی تبدیلیوں کا ذکر کیا تھا۔یہ مضمون ف، عبدالرحیم صاحب کی نظر سے گذرا تو انہوں نے اس کے استدلالات سے اختلاف کیا اور اس کی کمیاں دکھائیں۔

اسی طرح فروری ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر محمود حافظ عبدالرب مرزا کا ایک مراسلہ بعنوان ''سفر نامہ روم

ومصر شام میں بعض جدید عربی الفاظ کی وضاحت'' شائع ہوا تو ''سفر نامۂ روم ومصر وشام'' کی بحث ''حال کی عربی زبان پر ایک نظر'' کے عنوان سے سات صفحہ پر مشتمل ایک محققانہ مضمون معارف مارچ ۲۰۱۸ء میں سپرد قلم کیا۔اس مضمون میں اور باتوں کے علاوہ ڈاکٹر محمود مرزا کے بعض مشمولات کی تصحیح بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے علم فیلالوجی (علم الاشتقاق) اور تحقیق کی دنیا میں جس شان سے اپنی شناخت قائم کی اس کا شایان شان اعتراف یقیناً کیا جانا بلکہ ان کے کاموں کو آگے بڑھایا جانا چاہئے۔کسی موضوع پر کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی لیکن انہوں نے عربی لسانیات کے میدان میں جو متنوع الجہات کارنامے انجام دیے ہیں اس کے اثرات بہت دیر تک محسوس کیے جائیں گے۔ڈاکٹر صاحب پر اس وفیاتی مضمون میں ان کے سوانحی حالات اور علمی کمالات کا مجملاً احاطہ ان کی بعض مطبوعہ تصنیفات اور انٹرنٹ پر دستیاب معلومات کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ان کے اخلاقی اوصاف، شریفانہ مزاج، علم دوستی وادب شناسی کی داستان اور صحیح معنوں میں ان کی لسانی وادبی خدمات پر اظہار خیال تو اس صاحب ذوق کے قلم سے بھلا معلوم ہوگا جس نے ان کی علمی صحبت وہم نشینی سے فیض اٹھایا ہو۔ہندوستان میں تو ہمارے علم میں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب سے زیادہ ان کا قریبی دوست اور مقام آشنا کوئی اور نہیں ہے۔

## آہ! پروفیسر شارب ردولوی

گزشتہ دنوں اردو زبان وادب اور تنقید نے ایک ایسی شخصیت کو کھو دیا جس نے مشہور نقاد پرفیسر احتشام حسین سے فیض صحبت وتربیت حاصل کیا تھا۔اس کے تنقیدی کارناموں کی شہرت بہت دور تک تھی۔۱۸ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو خبر موصول ہوئی کہ کچھ عرصہ سے علیل پروفیسر شارب ردولوی نے منگل کے روز لکھنؤ میں زندگی کی آخری سانس لی اور وہیں کے عباس باغ قبرستان میں بدھ کے روز بعد نماز مغرب دفن کیے گئے۔اناللہ واناالیہ راجعون۔

لکھنؤ اور فیض آباد سے متصل ردولی، اترپردیش کی سرزمین علمی، روحانی اور تہذیبی لحاظ سے بہت زرخیز واقع ہوئی ہے۔اس کی خاک سے علم وادب اور تصوف وسلوک کے بڑے بڑے نامور اٹھے جن کے چشمہ ہائے علم وفضل سے ایک جہاں سیراب ہوا۔پرفیسر شارب ردولوی کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔

شارب ردولوی کے مورث اعلیٰ علی بلند دستار کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان کا تعلق افغانستان کے صوبہ بلخ سے تھا اور ان کا شمار اپنے دور کے بڑے علما اور مشہور صوفیوں میں ہوتا تھا۔۱۱۳۹ء میں بلخ سے نقل مکانی کر کے اپنے چار بیٹوں کے ساتھ ہندوستان آ گئے تھے۔ان کے اجداد میں حسن

محمود کے متعلق ہے کہ سلطان محمد غوری نے انہیں قاضی القضاۃ اور بادشاہ التمش نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے حسن محمود اور ان کے بھائی محمد حسن کو بالترتیب سلطان پور اور جائس کے قاضی کی حیثیت سے تقرری کی تجدید کی تھی۔ قاضی القضاۃ اس زمانہ کا بڑا اہم شاہی منصب ہوتا تھا۔ دادا غلام حسنین اور والد حسن عباس طبیب حاذق تھے۔ اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ مطالعہ کا شوق تھا۔ ان کے کتب خانہ میں بڑی نادر و نایاب کتابیں بھی تھیں۔

پروفیسر شارب ردولوی نے یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو شہر ردولی کے اسی زمیندار اور علمی خانوادہ میں آنکھیں کھولیں۔ لیکن دو یا ڈھائی برس کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور دادی اور پھوپھی کے سایۂ عاطفت میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ اصل نام تو مسیب عباسی تھا مگر قلمی نام شارب ردولوی اختیار کیا۔ اردو ادبیات کی اعلیٰ تعلیم بی، اے (آنرز)، ایم اے، پی ایچ۔ ڈی کی تمام اسناد لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ پروفیسر احتشام حسین کے زیر نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ ''جدید اردو ادبی تنقید کے اصول'' کے موضوع پر ۱۹۶۵ء میں لکھا۔ ۱۹۶۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے پہلی بار چھپ کر یہ کتاب منظر عام پر آئی تو اہل علم کے درمیان ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے سات ابواب میں ادب کی حقیقت و ماہیت، جدید اردو ادبی تنقید، رومانی و نفسیاتی تنقید، جمالیاتی و تاثراتی تنقید، تاریخی اور سائنٹفک تنقید اور آخری دونوں ابواب میں تحقیق و تنقید کی دوسری روایتوں اور مختلف اسالیب نقد کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں اپنے موضوع پر یہ بعض لحاظ سے منفرد تھی، اسی لیے اس کو تنقید کی اہم ترین اور مقبول و مستند کتابوں میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کی وقعت و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ شارب صاحب کو تنقید و تحقیق سے شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس تحقیقی مقالہ کی اشاعت سے قبل ہی شارب صاحب ارباب ادب و تنقید کے درمیان مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر، گل صد رنگ، افکار سودا، جگر فن اور شخصیت کے ذریعہ خود کو متعارف بلکہ اپنی ناقدانہ بصیرت کا لوہا منوا چکے تھے۔

پروفیسر شارب ردولوی نے دہلی یونیورسٹی کے دیال سنگھ کالج سے ۱۹۷۹ء میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۰ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت ریڈر ان کا تقرر عمل میں آیا اور ۲۰۰۰ء میں یہیں سے منصب تدریس سے سبک دوش وظیفہ یاب اور نوابوں کے شہر لکھنؤ میں اقامت مآب ہوئے۔ ان کی ملازمتی زندگی بڑی کشمکش اور آزمائشوں میں گذری اور بعض مقامات پر تو انہیں اپنوں ہی سے دھوکہ ملا۔

پروفیسر شارب صاحب نے ادبی سفر کی ابتدا سخنوری سے کی اور بڑی عمدہ اور پختہ غزلیں بھی کہیں لیکن ان کے بیان کے مطابق تنقید سے انہیں ایام طالب علمی ہی سے دلچسپی تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ تنقید کے میدان کو اپنی علمی و فکری جولان گاہ بنالیا اور اسی فضائے بسیط میں ان کا طائر تخیل و عمل معراج پر معراج حاصل کرتا رہا۔ اس جانب توجہ دینے کی ایک وجہ انہوں نے شروع میں یہ بھی لکھی ہے کہ تنقیدی اصول اور مسائل پر حالی کے بعد کسی نے باقاعدگی سے کام نہیں کیا۔ اب تک جتنا بھی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر عملی تنقید سے متعلق ہے۔ اصولی و نظریاتی تنقید پر کیا جانے والا کام رہنمائی کے لیے ناکافی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی عنان توجہ اس جانب موڑ دی۔ ۱۹۷۲ء میں مطالعہ ولی (تنقید و انتخاب) منظر عام پر آئی تو اس نے بھی اہل ادب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کو لکھنا پڑا ''ڈاکٹر شارب ردولوی نے ولی کے متعلق جملہ معلومات کا خلاصہ بڑی جامعیت کے ساتھ اس کتاب میں پیش کر دیا ہے''۔ ان کے علاوہ مختلف ادبی و تنقیدی موضوعات پر ان کی کل ۱۵ کتابیں شائع ہوئیں اور کئی کتابوں کے تو کئی کئی ایڈیشن نکلے۔ ''تنقیدی عمل'' اور ''جگر فن اور شخصیت'' کا شمار انہیں کتابوں میں ہے۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو، اسرار الحق مجاز ہندوستانی ادب کے معمار، مرثیہ اور مرثیہ نگار، تنقیدی مباحث، تنقیدی مطالعے، معاصر اردو تنقید اور ''ترقی پسند شعری فکر'' وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر شارب صاحب مسلسل علمی و ادبی انہماک کی لذت سے ایسے آشنا ہوئے کہ قلم کی روشنائی تادم واپسیں خشک نہیں ہونے دی۔ پروفیسر صاحب نے ۲۰۲۱ء میں فانی بدایونی کے اس مصرعہ ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم'' کو اپنی خود نوشت و خود گزشت کا عنوان بنا کر زندگی کے رنگ و نور اور نشیب و فراز کی ایسی عمدہ اور حقیقی تصویر کشی کی ہے کہ بڑے بڑے اہل قلم کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا ہے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی کا شمار اردو کے ان ممتاز ادیبوں اور ناقدوں میں ہوتا ہے جو شستہ اسلوب اور سلجھا ہوا مذاق سخن رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات و تحقیقات اعلیٰ معیار، وسعت مطالعہ، شگفتہ و معتدل انداز بیان اور ان کے ذوق سلیم کی آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے موضوعات کے انتخاب میں بڑی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے لہجہ میں ادعائیت بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ علمی، ادبی اور تحقیقی غلطیوں کی گرفت و تعاقب میں عام طور سے تنقید نگاروں کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے لیکن شارب صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ دانستہ طور پر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب سے جو لوگ قریب رہے وہ ان کی شرافت، مروت، تحمل، منکسر المزاجی، اصول

پسندی اور باغ و بہار شخصیت کے قائل و معترف اور انسانی کمیوں کی خوشہ چینی و خوردہ گیری سے محترز و مجتنب رہے۔

ان کی ادبی و تنقیدی خدمات پر ان کی حیات ہی میں ہندو بیرون میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر عرشیہ جبین کی کتاب ''شارب ردولوی شخصیت اور تنقید نگاری'' خاصا مشہور ہوئی۔ رانچی یونیورسٹی اور جے این یو کے بعض ریسرچ اسکالروں نے شارب ردولوی کی ادبی خدمات پر تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں۔ پاکستان کی سرگودھا یونیورسٹی کی رضوانہ صفدر نے ''شارب ردولوی کی تنقیدی جہات'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ان کے ادبی کارناموں کے اعتراف میں مختلف اکیڈمیوں نے انہیں ایوارڈ سے بھی نوازا ہے جن کا تذکرہ ان کے کمالات علمی کا مفصل خاکہ لکھنے والے کریں گے۔ ان کا اصل اعزاز و اکرام تو وہ ہے جو انہیں اپنے تلامذہ اور عقیدت کیشوں کی محبتوں کی شکل میں اس دنیوی زندگی میں ملا جن کے سہارے انہوں نے حیات مستعار کی خارزار وادیاں طے کیں اور کبھی تعب و تھکن محسوس نہیں کی اور اب اپنے عمل کے ساتھ اگلے پڑاؤ پر حاضر ہیں۔ اللھم اغفر لہ و ارحمہ وانت خیرالراحمین۔

ک، ص اصلاحی

## تبصرۂ کتب

**مقالات مورخ اسلام** از مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، مرتب مولانا نعیم الاسلام قادری، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۱۲، قیمت ۴۵۰ روپے، پتہ: کمال بک ڈپو، متصل جامعہ شمس العلوم گھوسی، ضلع مئو، یوپی۔

اسلامیات، تصوف اور حضرات صوفیہ، اہل علم ودانش، تاریخ اور شعر وادب، اس کتاب کے یہ چند ابواب ہیں، عنوان الگ الگ ہیں لیکن تاریخ نگاری کا انداز ہر جگہ صاحب مقالات کی سب سے نمایاں خوبی کا اعلان کرتا نظر آتا ہے، اس لیے غالباً مجموعہ کا نام مقالات مورخ اسلام رکھا گیا۔ فاضل مقالہ نگار اپنی گراں قدر اور کہا جائے تو نادر ونایاب کتابوں کو نئی زندگی عطا کرنے والی علمی خدمات کی وجہ سے تعارف کے محتاج نہیں، ان صفحات میں ان کی کئی کتابوں کا بھی ذکر آتا رہا ہے۔ خصوصاً بحر زخار کا ترجمہ تین جلدوں میں کمال کی چیز ہے۔ زیر نظر کتاب ان کے چند بہترین مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون توہین رسالت کی سزا کے عنوان سے ہے، قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ کے حوالوں سے انہوں نے ثابت کیا کہ علما وفقہاء نے رسالت مآبؐ کی شان میں گستاخی اور توہین کی جن سزاؤں کی توثیق کی ہے وہ قطعی مبنی بر انصاف اور درست ہیں، اس موضوع پر اس مقالہ میں سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ لیکن اصل جوہر تو حضرات صوفیہ کے ذکر میں کھلے، سید احمد کبیر رفاعی سے ذکر کی اس محفل کا آغاز ہوا اس ذکر میں چھٹی صدی ہجری کے عام مسلمانوں کی حکومت و معاشرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، امام غزالی اور ان کی احیاء علوم الدین کی خوبیوں کا ذکر آیا تو علامہ شبلی نعمانی کا ایک اقتباس بھی نقل کیا جو اسلوب شبلی کی شاندار مثال ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر بزرگ کے لیے امام فطرت، شیخ، مولانا جیسے تعظیمی الفاظ کا التزام تو ہے لیکن ہمارے مولانا صرف شبلی نعمانی ہی پکارے گئے۔ ورنہ سید احمد کبیر رفاعی کا تعارف شیخ طریقت، شمع ارباب ہدایت، سید السند، قطب الاوحد، امام الاولیاء جیسے القاب وخطابات سے ہے۔ فاضل مقالات نگار توازن واعتدال سے قربت اور غلو ومبالغہ سے پرہیز کی وجہ سے بھی ہر طبقہ میں محترم ومقبول ہیں، لیکن تاریخ نگاری محض روایات بیانی ہی تو نہیں، سید احمد کبیرؒ کے شکم مادر میں اپنی ماں سے گفتگو، گفتگو کیا، نصیحت وارشاد کے زریں اصول کی تلقین جن کو سن کر ماں کہہ اٹھی کہ حضرت عیسیٰؑ نے تو مہد میں گفتگو فرمائی تھی، یہ کیسی شان والا بچہ ہے جو میرے شکم میں رہ کر گفتگو کرتا ہے۔ اس واقعہ کے لیے بطور حوالہ تذکرۃ المتقین ص ۴۸ کا حوالہ ہے۔ ایک محقق مورخ کی نظر واقعات سے پہلے دفتر واقعات کی حقیقت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس قسم کی روایتوں سے دل ودماغ کو سرور جیسی کوئی کیفیت

حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن تعمیر حیات کی انسانی خواہش کہاں تک پوری ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی ملتا رہے تو بزرگوں کے حالات زیادہ مفید ہو سکتے ہیں، اس کی مثال میں خانقاہ شاہ ارزانی عظیم آباد اور خطہ اعظم گڑھ کو پیش کیا جاسکتا ہے، دسویں صدی ہجری میں شیراز ہند جونپور سے نسبت رکھنے والی ہستی آفتاب شریعت کہلائی۔ اتنی تحقیق و جستجو سے شاہ ارزانی کے بارے میں معلومات کا حصول شاید پہلی بار آسان ہوا۔ اسی طرح چہار پیر، چہار خانوادے اور خواجہ محمد نبی رضا شاہؒ پر مقالہ ہے۔ حضرات صوفیہ کے علاوہ امام صفاتی پر مضمون بھی بھرپور ہے۔ مشرقی یوپی کے بعض اہل علم و فضل کے نادر تذکروں نے بھی اس مجموعہ مضامین کی افادیت میں بڑا اضافہ کردیا۔ درمیان میں ایک عمدہ بحث حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے مابین نہایت خوشگوار تعلقات پر ہے اور جن سے بجا طور پر ان جھوٹی کہانیوں کا پردہ چاک ہوجاتا ہے جن سے سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں ان اساطین امت کے تعلق سے شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور بھی کئی مضامین ہیں، حصہ ادب میں مولانا احمد رضا خاں مرحوم کی فارسی شاعری تاج الشریعہ کی نعتیہ شاعری پر عمدہ گفتگو کی گئی، ان حضرات کی شاعری کے محاسن سے قطع نظر خود صاحب مقالات کی سخن فہمی داد طلب بن جاتی ہے۔ ایک مخصوص مکتبۂ فکر سے انتساب کے باوجود یہ کتاب ہر طبقے کے لیے پڑھنے کے لائق ہے۔

**(عمیر الصدیق ندوی)**

**ہندوستان کا پہلا جمہوری مدرسہ باقیات صالحات، ویلور اور دیگر مضامین:** مرتبہ ڈاکٹر راہی فدائی۔ کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۰۰، ملنے کا پتہ: ۲۸۹، گراؤنڈ فلور، سکنڈ بی۔ کراس، فورتھ بلاک، ایچ بی آر لے آؤٹ، بنگلور ۴۳۔ کرناٹک، قیمت: ۵۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۲ء۔ موبائل نمبر وای میل: درج نہیں۔

یہ کتاب مصنف کے چند اہم تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ شروع میں راہی کی پیچیدہ راہگذار تحقیق اور خود شناسی کے عنوان سے اپنے اور اپنے خانوادہ سے متعلق تفصیل بہم پہنچا کر آئندہ محققین کے لیے مستند مأخذ فراہم کردیا ہے اور کتاب کے آخر میں اپنا توقیت نامہ لکھ کر اس ضمن میں اور بھی آسانی پیدا کردی ہے۔ پہلے مضمون میں مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے متعلق ہے کہ اس کی بنیاد ۱۸۶۲ء میں رکھی گئی (ص ۶۳)۔ چھ سال بعد ۲۸ اپریل ۱۸۸۸ء کو ۱۹ اراکین پر مشتمل کمیٹی کو رجسٹرڈ کرایا گیا اور چلانے کے لیے اصول و ضوابط کی منظوری حاصل کی گئی۔ مصنف کا یہ دعویٰ بھی قابل ذکر ہے کہ امیروں، حاکموں اور ذاتی سرپرستی سے ہٹ کر باقاعدہ جمہوری نظام کے تحت چلنے والا یہ ہندوستان کا

پہلا جمہوری مدرسہ ہے۔اس کی شاخیں ہندو بیرون ہند میں پھیلی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے آج دنیا اس کو ام المدارس کے لقب سے جانتی ہے اور اب یہ ترقی کر کے جامعہ باقیات صالحات ہو گیا ہے۔اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے دستور میں شیعہ سنی دونوں مکاتب فکر کے افراد کے داخلہ اور تعلیم حاصل کرنے کا قانوناً جواز ہے (ص۶۶)۔ مصنف کے بقول اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔اس کے علاوہ اس میں مدرسہ کی سالانہ دستار بندیوں اور بعض انتظامی تبدیلیوں کی تفصیل موجود ہے اور لکھا گیا ہے کہ ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر دنیا بھر سے ۴۰ ہزار علمانے اس میں شرکت کی لیکن اس کے نصاب درس اور تعلیمی ترقیوں کا تذکرہ بہت کم ہے۔دوسرے مضمون میں خانقاہ اقطاب، ویلور سے وابستہ علما اور مبلغین کی اصلاحی اور تبلیغی کوششوں پر جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک مضمون میں علامہ باقر آگاہ ویلوری کے سوانح اور ان کے علمی وادبی کوائف کی تفصیل ہے۔اس کے علاوہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے علمائے جنوب کے افاضات اور علامہ شاہ کمال بخاری اور علامہ اختر کڈپوی کے شاعرانہ کمالات پر ادیبانہ اور پر مغز گفتگو کی گئی ہے۔ جنوب و شمال کے علمی روابط کی اہم کڑی کے طور پر شیخ الہند کے مدراسی شاگرد علامہ عبدالرحیم کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے۔

ڈاکٹر راہی فدائی کے اسلوب میں جاذبیت اور بیان میں حلاوت و سلاست ہوتی ہے۔بنگلورو کی علمی وادبی مجلسیں ان کے وجود کے بغیر بے رونق سمجھی جاتی ہیں۔انھوں نے جنوب کے اصحاب کمال اور اس علاقہ کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کے مستند اور قیمتی معلومات سے عام اہل علم وادب کو اپنے خاص انداز میں متعارف کرانے کا جو بیڑا اٹھایا ہے، یہ کتاب اس طویل سلسلہ کا ایک زریں حصہ ہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان کی یہ محنت دوسرے محققین کے لیے قابل تقلید اور کتاب لائق مطالعہ واستفادہ ہے۔

**(کلیم صفات اصلاحی)**

**ضیائے غزل (غزلیں، نظمیں، قطعات):** قاری اشتیاق احمد ضیاء جونپوری، مرتب و تزئین کار، محمد عرفان جونپوری، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۵۶۔ ملنے کا پتہ: ۲۰۳ عزیزیہ پبلی کیشنز، میر مست، جونپور۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر ۹۸۸۹۱۲۴۰۵۶۔

کائنات ضیاء کے بعد ہی قاری اشتیاق احمد ضیاء صاحب کی شاعرانہ خوش فکری و خوش نوائی اور ان کے لب ولہجہ کا اندازہ ہو گیا تھا۔اب ضیاء غزل نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں اور قطعات کی شکل میں جو روشنی بکھیری ہے، اس نے کلام میں مزید تازگی، تیرگی اور پختگی کا احساس کرانے میں کامیابی

حاصل کی ہے۔شروع کے تقریباً ۲۶/ صفحات میں چند مشہور جونپوری علما،ادبا اور شاعروں نے ضیاء صاحب کی شاعرانہ شخصیت کے مزاج واوصاف بالخصوص غزل گوئی کے فن میں ان کی مہارت پر مدلل گفتگو کی ہے۔حالانکہ ضیاء صاحب کا یہ اعتراف بھی ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

ہمیں تو شاعری آتی نہیں ہے غزل کہنے کی خواہش ہو رہی ہے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ضیاء صاحب کو اصناف شاعری میں صنف غزل سے زیادہ انس ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ غزل کی پہنائیوں میں جتنی وسعت ہے وہ کسی اور صنف شاعری میں کہاں؟۔اس میں نہایت خوبی سے شاعر اپنے ہر قسم کے جذبہ وخیال کی ترجمانی کرسکتا ہے۔ضیاء صاحب نے معاشرہ کے اندر پائے جانے والے مسائل،تکلیف دہ حالات،کمزوروں،بیکسوں اور مجبوروں کی مشکلات کو موضوع سخن بنایا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شاعری مقصدیت سے پر ہے۔انھوں نے پیشۂ شاعری لطف ولذت طبع کے لیے نہیں بلکہ مسائل کے حل کے لیے ایک مضبوط آواز وہتھیار کے طور پر اختیار کیا ہے۔ان کی غزلوں میں حوصلہ وہمت ہے۔ظلم وجبر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا جذبہ ہے۔مایوسی کا گذر نہیں۔اس سلسلہ کے چند اشعار دیکھیں۔

کب کسی کے سامنے جھکتا ہوں میں ہاں مگر اللہ سے ڈرتا ہوں میں
حوصلہ کچھ اور ہوتا ہے بلند راستے کی دیکھ کر دشواریاں

ظلم کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کا یہ انداز دیکھیں:

خود بتا مجھ سے پوچھتا کیا ہے ظلم اور اس کی انتہا کیا ہے
یہ جفا کیا ہے یہ وفا کیا ہے حرف بدلا ہے فاصلہ کیا ہے

چھوٹی بحر کے ان اشعار میں ظالم کے سامنے حوصلہ وہمت اور بے جگری کا یہ تیور دیکھیں:

اترا کے یوں نہ چل گر جائے گا سنبھل
تم کو ترا غرور رسوا کرے گا کل
سچائی کر قبول گمراہی سے نکل

تعلیم وتربیت دینی نہج پر ہوئی ہے،اس لیے غزلوں کے اشعار بھی طہارت وپاکیزگی،شائستگی اور مذہبی فکر میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان میں سلاست وروانی بھی غضب کی ہے۔

محبت میری نذرانے میں رکھئے دل بیتاب شکرانے میں رکھئے
تقدس کے حسیں خانے میں رکھئے مجھے تسبیح کے دانے میں رکھئے

مقدر سے ہے ملتا جام عرفاں اسے محفوظ پیمانے میں رکھئے

ضیاء صاحب نے ملک وطن اور قوم وملت سے محبت کے ثبوت بھی نظموں اور قطعات کی صورت بہم پہنچائے ہیں اور شیراز ہند جونپور، اردو، عید، دیوالی، بھارت، رام چندر جی وغیرہ جیسے خاص عناوین کے تحت بڑی متاثر کن اور دلکش نظمیں لکھ کر اپنے قارئین کو باہمی اتحاد، رواداری اور مذہبی ہم آہنگی کو بہر صورت باقی رکھنے کا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ایشور اللہ کہتے جاؤ جیون اپنا سپھل بناؤ
امن و امان کا دیپ جلاؤ دھرتی کو آکاش بناؤ
جو ہے مالک سارے جگ کا اس کے آگے شیش جھکاؤ
توڑ دو نفرت کی دیواریں الفت کا پرچم لہراؤ
ساری دنیا ویاکل لاگے پیار کی گنگا ضیاء بہاؤ

عمدہ غزلوں اور نظموں کے اس مجموعہ ضیائے غزل کے متعلق امید یہی ہے کہ ارباب شعر وسخن کی بارگاہ میں مقبول ہوگی۔ **(ک، ص اصلاحی)**

**مستند اور مفید معلومات حصہ اول:** تالیف مولانا محمد اویس قاسمی۔ کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۶۰، ملنے کا پتہ: مکتبہ نعیمیہ صدر بازار، مئو۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔ سن طباعت: درج نہیں۔

سبیل العارفین (بزرگوں کے اقوال)، چہل حدیث، آسان عمرہ اور نماز کو قائم کیجیے وغیرہ جیسی مفید و نفع بخش کتابوں کے مصنف کو کتب تاریخ وسیر کے مطالعہ کا بھی شوق ہے۔ مشہور و مستند عرب اور ہندوستانی مصنفین کی کتابوں سے کام کے اردو اقتباسات پہلے انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیے۔ اس کے بعد اسلامیات، نوادرات و شخصیات، تاریخیات اور متفرقات کے جلی عناوین کے تحت انہیں کتابی شکل میں مرتب کر کے ایک اور کارآمد تالیف تیار کردی ہے۔ ان اقتباسات کو نقل کرنے کے پیچھے مؤلف کا مقصود ہر طبقہ کے قارئین کے اندر اپنے عظیم الشان ماضی سے موجودہ نسل کو متعارف کرانا اور ان کے اندر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

متنوع مطالعات کے منتخب اقتباسات میں نامور سلاطین و امرا، مشائخ و علما، اسلامی سلطنتوں کا ذکر بھی ہے اور دینی و تعلیمی مراکز کا حال بھی، قرآن و حدیث اور سیرت و فقہ سے متعلق معلومات کا احاطہ بھی ہے اور ادب و تاریخ اور مختلف علوم و فنون سے متعلق مطالعات کا تذکرہ بھی۔ اس لیے اس کتاب کی

افادیت میں شک نہیں۔ مولانا نے اس کتاب کے ذریعہ قارئین کو کتابوں کے ایسے چمن کی سیر کرائی ہے جہاں سے اس کا طائر فکر مختلف قسم کے گلوں سے رس چوس کر خود کو شاد کام ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے اپنی قوت عمل اور متنوع الموضوعات مطالعہ کے شوق وذوق میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے خود مرتب کے طرز مطالعہ، وسعت معلومات، دینی مزاج، فکرو تحقیق اور اسلامی وہندوستانی تاریخ سے دلچسپی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مولانا نے مختلف موضوعات پر جن کتابوں سے یہ مفید اقتباسات نقل کیے ہیں ان میں بیشتر کے نام مع صفحات درج کیے ہیں۔ مطابع اور سنۂ اشاعت لکھنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ بعض کتابیں نسبۃً غیر معروف اور کم مستند ہیں۔ مثلاً فضائل صدقات اور بکھرے موتی وغیرہ کی شہرت ابن کثیر اور الفاروق وغیرہ کے درجہ کی نہیں ہے کہ عام قاری صرف ان کے نام پڑھ کر ان کے مصنف یا اس کے مرتبۂ استناد کو سمجھ جائے۔ اس قسم کی محولہ کتابوں کے مکمل حوالے دیے گئے ہوتے تو ''مستند اور معلومات'' کے استناد میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ (ک،ص اصلاحی)

# ادبیات

## غزل

### ہنگامہ در ہنگامہ

**زاہد جعفری**

جعفری باغ، جلال پور، امبیڈکر نگر، موبائل:۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸

وقت، سانس، موسم، دل، روزگار ہنگامہ — زندگی کی تھیٹر کا شاندار ہنگامہ

زُور، شُور، رُوز و شب اشتہار ہنگامہ — شہرتوں کا پاگل پن، کاروبار ہنگامہ

آدمی کے ذہنوں پر ہے سوار ہنگامہ — آگے پیچھے ہوتا ہے، آرپار ہنگامہ

دل کی دلّی بیچاری بار بار روتی ہے — ہونا تھا تو ہو جاتا ایک بار ہنگامہ

میں ہوں، میرا کمرہ ہے شب ہے اور تنہائی — پیار، یاد، آنسو، دل، انتظار ہنگامہ

جل چکا نگر سارا، راکھ ہے نہ چنگاری — اب تو اپنا خود ہی ہے سوگوار ہنگامہ

شاخ شاخ روتی ہے! کہہ کے "پی کہاں" کوئل — بَور کیوں مچاتا ہے؟ خوشبودار ہنگامہ

دور، اک ندی چپ چاپ انتظار کرتی ہے — کر رہا ہے وادی میں، آبشار ہنگامہ

گونگی شمع روتی ہے، کیوں پتنگے جلتے ہیں؟ — لگتا ہے! کہ لگتا ہے ناگوار ہنگامہ

بے زبان آنسو کی خامشی کو سمجھو تو! — تہ میں ہے سمندر کی بے شمار ہنگامہ

میں ہوں اور مٹّی کا پُرسکون تہہ خانہ — کرتی ہے کرے دنیا، اب ہزار ہنگامہ

شعر میں اگر زاہدؔ میر کا ہنر ہو تو

ہے غزل میں پوشیدہ جاندار ہنگامہ

# معارف کی ڈاک

اکتوبر ۲۰۲۳ء کا ''معارف'' پیش نظر ہے۔اس کے صفحہ ۲۷ پر اس جویائے خیر کی نعت کی اشاعت کے لیے سپاس گزار ہوں۔دیگر یہ کہ:

نعت کے چوتھے شعر کے پہلے مصرع میں پانچوے شعر کے پہلے مصرعے کا ایک ٹکڑا اجڑ گیا اور مصرعے کا وزن اور معنی دونوں پر اثر انداز ہوا ہے۔جب کہ پانچوے شعر کے پہلے مصرعے کو دو لفظ کم ہونے کے باوجود کتابت میں دوسرے سب مصرعوں کے برابر کردیا گیا (جو دلیل ہنر مندی ہے)

.....بہر حال وہ دونوں شعر جن میں (سہواًہی سہی) تصرّف بے جا دخل پا گیا ہے،اس طرح ہیں:

''فابعونی'' نے سب پردے ہٹائے دل کے　　پا گیا رازِ محبّت مرا ذہن درّاک

تاجِ کسریٰ کو نہ کیوں روندتے پھر ان کے قدم　　وجہِ عزت تھی جنہیں آپؐ کے نعلین کی خاک

جویائے خیر

**ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی**، علی گڑھ

# رسید کتب موصولہ

**اکثر یاد آتے ہیں:** مولانا عبدالعلی فاروقی، مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ، صفحات ۲۰۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۱۱۰۴۶۳۔

**تذکرہ فخر المحدثین:** مرتب، مولانا ضیاءالحق خیر آبادی، مکتبہ الفہیم، صدر چوک، مئو ناتھ بھنجن، صفحات ۹۴۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۱۱۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۳۶۷۶۱۹۲۶۔

**ٹووارڈس دی رینائسینس شبلی اینڈ مولانا تھانوی آن شریعہ (انگریزی):** فرقان احمد، دی انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نیو دہلی، صفحات ۵۶۳، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں۔

**چشمے کی تلاش:** جہانگیر انس، عثمانیہ بک ڈپو کولکاتا، صفحات ۱۲۸، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۳۳۰۵۰۶۳۴

**حیات وخدمات (مولانا شاہ محمد عبدالرحیم نقش بندی مجددیؒ):** مرتبین، مولانا محمد فضل الرحیم مجددی، مولانا محمد شمشاد ندوی، مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، سہارن پور، صفحات ۴۴۸، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۶۰۸۶۶۱۳۰

**خلیل الرحمن اعظمی (رسالہ بیداری سے مقدمہ کلام آتش تک):** محمد مرسلین اصلاحی، مکتبہ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، صفحات ۱۲۴، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۸۰۰۴۶۴۲

**رموزِ دواسازی:** حکیم فخرِ عالم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ، صفحات ۳۶۳، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۶۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۱۶۵۳۰۴۱

**صحابیات اور نسائی تحریکات:** مرتب، پرفیسر محمد طاہر، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، صفحات ۳۳۱، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۳۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۴۱۶۸۷۸۶

**طبّی اخلاقیات:** حکیم فخرِ عالم، ویسٹ بلاک ۸، آر، کے پورم، نئ دہلی، صفحات: ۲۳۴، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، فون نمبر: ۲۶۱۰۹۷۴۶

**عورتوں کے ساتھ نبی ﷺ کا برتاؤ:** ابو حمود حافظ عبدالسمیع کلیم اللہ المدنی، جامعہ اسلامیہ دریاباد، سنت کبیر نگر، (یو.پی)۔ صفحات ۳۲۰، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۴۹۷۴۳۰

# تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن) | 2000/- |
| سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) | 2800/- |
| مقدمہ سیرۃ النبیؐ | 30/- |
| الفاروق | 350/- |
| الغزالی | 300/- |
| المامون | 175/- |
| سیرۃ النعمان | 400/- |
| سوانح مولانا روم | 220/- |
| شعر العجم (اول) | 250/- |
| شعر العجم (دوم) | 150/- |
| شعر العجم (سوم) | 150/- |
| شعر العجم (چہارم) | 200/- |
| شعر العجم (پنجم) | 150/- |
| مکاتیب شبلی (اول) | 150/- |
| مکاتیب شبلی (دوم) | 190/- |
| الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | 350/- |
| خطبات شبلی | 150/- |
| موازنہ انیس و دبیر | 250/- |
| اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر | 125/- |
| سفر نامہ روم و مصر و شام | 200/- |
| کلیات شبلی (اردو) | 220/- |
| کلیات فارسی (فارسی) | -- |
| مقالات شبلی اول (مذہبی) | 170/- |
| مقالات شبلی دوم (ادبی) | 70/- |
| مقالات شبلی سوم (تعلیمی) | 170/- |
| مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) | 200/- |
| مقالات شبلی پنجم (سوانحی) | 150/- |
| مقالات شبلی ششم (تاریخی) | 150/- |
| مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) | 100/- |
| مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) | 150/- |
| الندوہ (۹ جلدیں) | 4735/- |
| اسلام اور مستشرقین (چہارم) | 250/- |
| الکلام | 350/- |
| علم الکلام | 200/- |
| انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی) | 200/- |

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print DEC 2023 Vol. 210/12

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

*Monthly Journal of*

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

---

## دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| سیرت عمر بن عبدالعزیز | مولانا عبدالسلام ندویؒ | 100/- |
| مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں | پروفیسر اشتیاق احمد ظلی | 250/- |
| مطالعات شبلی | ״ ״ | 550/- |
| حیات سعدی | خواجہ الطاف حسین حالی | 400/- |
| شبلی شناسی کے اولین نقوش | پروفیسر ظفر احمد صدیقی | 600/- |
| شبلی کی آپ بیتی | مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم | 325/- |
| امام رازی | مولانا عبدالسلام ندویؒ | 320/- |
| حیات سلیمان | شاہ معین الدین احمد ندویؒ | 600/- |
| تذکرۃ المحدثین (اول) | مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ | 200/- |
| تذکرۃ المحدثین (دوم) | ״ ״ | 225/- |
| تذکرۃ المحدثین (سوم) | ״ ״ | 300/- |
| محمد علی کی یاد میں | سید صباح الدین عبدالرحمنؒ | 120/- |
| مولانا ابوالکلام آزاد | مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ | 240/- |
| ابن رشد | محمد یونس فرنگی محلیؒ | 330/- |
| تاریخ اسلام (اول ودوم مجلد) | شاہ معین الدین احمد ندویؒ | 560/- |
| تاریخ اسلام (سوم وچہارم مجلد) | ״ ״ | 500/- |
| تاریخ اندلس (۴ جلدیں) | سید ریاست علی ندویؒ | 1200/- |
| مصادر سیرت نبوی | کلیم صفات اصلاحی | 600/- |
| اسلام میں مذہبی رواداری | سید صباح الدین عبدالرحمن | 250/- |
| یہود اور قرآن | مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ | 150/- |
| تاریخ ارض القرآن | مولانا سید سلیمان ندویؒ | 550/- |